مشورے اور گزارشیں

یا

کارآمد نصیحتیں

از

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب:

م الرحمن صدیقی

ناشر

العلم پبلشرز ۱۲۳/۳۲ بی۔ این۔ ورما روڈ۔ لکھنؤ یوپی (انڈیا)

مشورے اور گزارشیں

یا

کار آمد نصیحتیں

از

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ:

نعیم الرحمٰن صدیقی

ناشر

ال۱۔ پبلشرز ۱۷۳/۳۲ بی۔این۔ورما روڈ۔ لکھنؤ یو۔پی (انڈیا)

- نام کتاب —— مشورے اور گزارشیں
- مرتّب —— نعیم الرحمٰن صدیقی
- طبع اوّل —— گیارہ سو (۱۱۰۰)
- سنہ اشاعت —— ۱۹۹۲ء
- قیمت: —— تیس (۳۰) روپیے
- کاتب: —— حسن اختر لکھنؤ
- مطبوعہ —— نامی پریس لکھنؤ
-

ناشر:—

العلم پبلشرز

بی۔ این۔ ورما روڈ، لکھنؤ (یوپی)

ملنے کے پتے:—

- صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ
- مکتبۃ الشباب۔ بردلیا ٹیگور مارگ۔ لکھنؤ
- المکتبۃ الندویۃ۔ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
- اسلامی بک ہاؤس۔ مسجد ٹرائن، امین آباد پارک، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتّب

احقر کی یہ پہلی طالب علمانہ اشاعتی کوشش مفسرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (مدیر صدق جدید) کے ان گرانقدر مضامین پر مشتمل ہے جوان کے مشہور ہفتہ وار اخبار صدقِ جدید میں "مشورے اور گزارشیں" کے عنوان سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے تھے۔ بہت سے صدق خواں ان سے اصلاح و تربیتِ نفس کا تحریری تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مختلف النوع سوالات کے مدلّل و مشفقانہ جوابات مولاناؒ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مخصوص طرزِ نگارش میں دیتے تھے یہ مشورے بہت سے دینی و دنیوی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کو زندگی میں مختلف مراحل اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ طرح طرح کے وساوس اور شکوک اس کو اپنے عقائد و اعمال کے بارہ میں پیش آتے ہیں جن کے مناسب جوابات نہ ملنے سے وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ مولاناؒ کے دیئے ہوئے جوابات پڑھنے والوں کے لیے شمعِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ سلسلۂ مضامین مدّتوں جاری رہا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو اللہ تعالیٰ نے توازن کی عظیم

دولت سے نوازا تھا۔ وہ افراط و تفریط کی آلائشوں سے پاک تھے۔ ان کے اس مخصوص سلسلۂ مضامین میں بھی ان کا یہ وصف پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ اپنے اس سلسلۂ مضامین کی اشاعت کے لیے بہت بے چین رہتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ:

"میرے اور کالم شذرے، نوٹس وغیرہ تو سب کھلجھڑی اور وقتی ہیں۔ آخرت میں کام تو یہی سلسلۂ مضامین (مشورے اور گزارشیں) آئے گا۔"

مگر افسوس کہ ان کی یہ تمنا ان کی حیات میں پوری نہ ہو سکی۔ الحمدللہ اب اس سلسلۂ مضامین کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں تیس مضامین شامل ہیں۔ اس طرح کئی جلدوں میں یہ سلسلہ مضامین شائع ہوتا رہے گا ان شاء اللہ۔ مولانا مرحوم کی اور کتابوں کی طرح اس کتاب کے بھی دو نام "مشورے اور گزارشیں" یا "کارآمد نصیحتیں" رکھے گئے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے برادرزادہ اور جانشین اور میرے نانا جناب حاجی حافظ حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی اطال اللہ عمرہٗ نے میری اس اولین کاوش کو سراہتے ہوئے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے اپنا قیمتی وقت نکال کر میرے نقل کردہ مسودہ کی تصحیح کی اور میری ہمت افزائی فرمائی اور ایک بیش قیمت پیش لفظ تحریر فرمایا۔ جس کے لیے میں ان کا انتہائی ممنون ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے قبل یہ پیش لفظ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

اس مجموعے کی طباعت و اشاعت کی سعادت میرے خصوصی کرم فرما جناب

حاجی سیّد محمّد ہارون صاحب (مالک العلم پبلشرز) کو حاصل ہوئی کہ انھوں نے اپنی بہت سی مشغولیتوں کے باوجود کاغذ، کتابت اور طباعت کی اس ہوشربا گرانی کے دور میں مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ کی اس دیرینہ آرزو کو پورا کیا جو اس سے پہلے پوری نہ ہو سکی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ جزیل عطا فرمائے اور اس کتاب کو حسنِ قبول نصیب ہو۔

آخر میں محبّی خواجہ نورالدین صاحب مالک نامی پریس لکھنؤ کا شکریہ ضروری ہے جن کی مخلصانہ مدد سے یہ کتاب حسنِ طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہو سکی۔۔۔

۵ جون ۱۹۹۲ء
خاتون منزل لکھنؤ

ہیچمدان
نعیم الرحمٰن صدیقی

فہرست عنوانات

صفحہ

صفحہ

از۔ جناب حکیم عبدالقوی دریابادی مدظلہ،

جانشین حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رح

پیش لفظ

عمّ مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی زندگی میں بہت سی کتابیں لکھیں، جن کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اُن کی وفات کے بعد ان کے مضامین اور افادات کے متعدد قابل قدر مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین اور افادات ان کے ہفتہ وار اخبار (۱) 'سچ' (۲) 'صدق' اور (۳) 'صدق جدید' (لکھنؤ) میں شائع ہو چکے تھے۔ 'صدق جدید' میں ایک سلسلہ 'مضامین و مشورے اور گزارشیں' کے عنوان سے گاہ بگاہ نکلتا رہتا تھا۔ اس میں صدق خواں معتقدوں کے قسم قسم کے سوالات زیادہ تر تربیتِ نفس اور ان وَسوَسوں اور شکوک کے ازالہ اور معالجہ سے تعلق رکھتے تھے جو اکثر لوگوں کو ان کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔

ایسے ہر مضمون میں 'س' کی علامت کے بعد سائل کا سوال درج ہوتا تھا اور 'ج' کی علامت کے بعد اس کا مفصّل اور تشفی بخش جواب مولانا رح کے قلم سے سادہ اور سلیس زبان میں ہوتا تھا۔ ان مضامین کا طرزِ تحریر مولانا رح کی دوسری ادبی تحریروں سے خاصا مختلف ہوتا تھا تاہم اثر اور دل نشینی میں وہ کچھ کم

نہ ہوتا تھا۔ مولانا کو بڑی تمنّا تھی کہ ان کی زندگی میں ان مضامین کا مجموعہ ان کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہو جائے۔ افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی — اب ان کی وفات کے تقریباً بارہ سال کے بعد ان مضامین کا پہلا حصہ شائع ہو رہا ہے۔

صدقِ جدید کے پرچوں سے ان مضامین کو نقل کرنے اور مرتب کرنے کی سعادت میرے نواسہ (مولانا مرحوم کے پرنواسے اور قدیر الزماں صاحب مرحوم کے پوتے) حافظ نعیم الرحمٰن سلّمہ، متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اشاعت کا اجر ان کے ایک مخلص دوست سیّد محمّد ہارون صاحب، کاغذ اور سامانِ طباعت کی بے پناہ گرانی کے زمانے میں حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ (آمین)

مولانا نے ان جوابات میں بڑے کام کی باتیں بہت سے دینی اور دنیوی معاملات اور مسائل کے بارے میں تحریر فرمائی ہیں جو آج بھی بہت سے بھٹکے ہوؤں کو راہِ ہدایت دکھا سکتی ہیں اور شکوک اور وسوسوں کے گرفتار افراد کو سکون بخش سکتی ہیں۔

ہر قسط پر عنوان اس کے مندرجات کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں۔ بعض قسطوں میں ایک سے زائد حضرات کے سوالات ایک سے زائد مسائل کے متعلق ہیں۔ ان قسطوں کے عنوانوں میں عموماً سب سے اہم مضمون کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن بعض قسطوں میں ایک سے زائد عنوانات درج شدہ جوابات کے تنوع کے باعث قائم کیے گئے ہیں۔

مولانا مرحوم نہ تو باقاعدہ صاحبِ فتویٰ عالم تھے اور نہ اصطلاحی معنی

میں پیر طریقت۔ اس کی تصریح انھوں نے ان مضامین کے سلسلے میں متعدد بار کردی ہے۔ تاہم ان کا مطالعہ مذہبی علوم کا بہت وسیع اور عمیق تھا۔ زندگی کے ایک دور میں وہ نامور فلسفی اور نفسیات کے خصوصی رمز شناس رہ چکے تھے ان کے حکیمانہ اور تشفی بخش جوابات میں اُن کی یہ حیثیت پوری طرح نمایاں ہے۔

(حکیم) عبدالقوی دریابادی
لکھنؤ

①

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّف کا اسلام سے تعلق

(س) (مختصراً) تصوف کیا ہے ؟ اور اسلام سے اس کا کیا تعلق ہے ؟ مفصّل جواب صدق کے ذریعہ عطا ہوتا کہ اجتماعی فائدہ پہنچے۔ احتیاطاً جواب کے لیے ٹکٹ بھی میں نے رکھ دیا ہے (آگے موجودہ مرشدوں کی بدعات وخرافات کا مفصّل ذکر ہے)۔

(ج) صدق میں اس موضوع پر لکھنے کی نوبت دیکھیے آئے بھی کہ نہ آئے اور آئے بھی تو کب آئے اس لیے مختصراً جواب لفافہ ہی میں لکھے دیتا ہوں خدا کرے کافی ہو جائے۔

تصوّف یا سلوک یا طریقت، شریعت سے مختلف کوئی چیز نہیں بلکہ **اسی کی مکمل اور انتہائی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔** شریعت کی تعمیل محض ضابطہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً نماز اگر محض ارکان ظاہری اور فقہی شرائط کی پابندی سے پڑھ لی جائے تو بس ادا ہو جائے گی اور پڑھنے والا جنّت کا مستحق ہو جائے گا۔ لیکن اگر نماز میں پوری طرح جی لگنے لگے اور حضورِ قلب کی

لذت حاصل ہونے لگے تو یہی نماز عارفوں کی نماز ہوجائے گی۔ یہی حال روزہ اور ساری عبادات اور سارے اخلاق و معاملات کا ہے۔

شریعت اگر محض عبادت اور تعمیل ہے تو طریقت عبادت مع لذت وحلاوت اور تکمیل ہے۔ اکابر و ائمۂ تصوّف، عملاً جنید بغدادیؒ، شیخ جیلانیؒ کی زندگیوں نے یہی نمونہ پیش کیا ہے۔ بہ قول اکبر الٰہ آبادی ؎

عبادت سے عزت شریعت میں ہے
عبادت میں لذت طریقت میں ہے

شریعت درِ محفلِ مصطفےٰؐ — طریقت عروجِ دلِ مصطفےٰؐ
شریعت میں آثارِ راہ خدا — طریقت میں انوارِ راہِ خدا

اور ؎

ملّا یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن ہی سے بڑھئے
صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے

اس حقیر کی ایک پرانی کتاب ہے "تصوّفِ اسلام" کے نام سے، اگر اس کا تیسرا ایڈیشن کہیں سے حاصل ہو سکے تو ایک بار اس کا مطالعہ کر لیا جائے۔

(س) معجزات اب کیوں نہیں واقع ہوتے۔؟

(ج) اس لیے کہ اب انبیاء مبعوث نہیں ہوتے۔

معجزات اصطلاحی معنی میں نبی کی نبوت ہی کی تصدیق و اثبات میں اس کے ہاتھ سے صادر کرائے جاتے ہیں۔ سو اس کا ظاہر ہے کہ

اب کوئی محل ہی باقی نہیں رہا۔ البتہ لفظ کے وسیع مفہوم میں اس کا اطلاق ہر واقعہ خارق عادت پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسا واقعہ جو معمول عام کے خلاف اور انسان کو چونکا دینے والا ہو۔ اسی وسیع معنی میں آیاتِ الٰہی یا معجزات تکوینی کا صدور ہر روز اور بکثرت ہوتا رہتا ہے اور اہلِ بصیرت ان سے درسِ ہدایت لیتے رہتے ہیں۔

(س) جماعتِ اسلامی و جماعتِ تبلیغی کے علاوہ یہاں ایک چھوٹا سا حلقہ اہلِ تصوف کا بھی ہے۔ اور یہ لوگ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے مسترشدین میں سے ہیں۔ ان کی ایک مختصر نشست ہر جمعرات کو بعد مغرب ہونے لگی ہے جس میں مولانا مدظلہٗ کا کوئی رسالہ پڑھا جاتا ہے اور اس کی شرح و تفسیر کی جاتی ہے، اس میں شریک ہوجاتا ہوں اور کچھ نہ کچھ فائدہ بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

(ج) جتنا بھی نفع حاصل ہوجائے بہرحال غنیمت ہے، اور اکثر دوسرے مشاغل سے یہ وقت انشاء اللہ بہتر ہی شغلہ میں کٹتا ہوگا۔

(س) جو صاحب بیان فرماتے ہیں وہ عربی کے عالم ہیں اور علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں، لیکن یہاں کے ماحول میں اپنا ذہن بھی حاضر نہیں رہتا۔ خود تقریر کے متعلق طرح طرح کی باتیں ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ خطابت وغیرہ سے بھی طبیعت الجھتی ہے۔ کبھی کبھی مسائل میں بھی اختلاف محسوس کرتا ہوں۔ نفسِ مسئلہ میں نہیں تو طرزِ استدلال و تعبیر میں۔

(ج) خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِرَ پر عمل کا یہی موقع ہوتا ہے جن باتوں

پر شرح صدر ہو جائے، بس انھیں قبول کر لیا جائے۔ باقی کے لیے یہ سمجھ لیا جائے کہ کلام کسی معصوم یا نیم معصوم کا تو ہے نہیں۔

(س) محسوس ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ کی جو نفسِ نوعیت ہے اس پر گفتگو کم ہوتی ہے اور اپنے ذوق و وجدان کی بات زیادہ ہوتی ہے۔

(ج) یہ توازن کی کمی بڑے بڑوں میں پائی گئی ہے اور بڑی پھیلی ہوئی کمزوری ہے مگر بہر حال اس سے نباہ کرنا ہی ہے۔

(س) مثلاً ایمان کے سلسلے میں ایک بار یہ فرمایا کہ زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اس کا کچھ وزن نہیں، تا وقتیکہ ایمان دل میں نہ اُتر جائے۔

(ج) مُراد یہ نہ رہی ہوگی۔ اغلب خیال یہ ہے کہ زبان ما فی الضمیر کا پُورا ساتھ نہ دے سکی۔ کمالِ ایمان اور شے ہے اور نفسِ ایمان اور تصدیق بالقلب تو خیر بڑی چیز ہے۔ ایک درجہ تو اقرار باللسان کا بھی ہے۔

(س) بات ٹھیک ہی ہوگی۔ لیکن یہ طرز بیان پسند نہیں آتا۔ ایمان کمتر ہی درجہ میں ہو اور کتنی ہی ضعیف حالت میں ہو، بہر حال اس کو ایک جگہ دینی چاہیے اور اس کی قدر کرنی چاہیے اور اس کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کی ترغیب ہمدردی اور دانش مندی کے ساتھ دینا چاہیے۔ اپنے سامنے یہ بات رہتی ہے کہ معلم یا مصلح کو اپنے احوال یا کیفیات سے زیادہ طالب علم یا متعلم کی حالت و کیفیت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

(ج) ماشاء اللہ! یہ ساری باتیں فہمِ سلیم ہی سے نکلی ہیں — بارک اللہ۔

(س) ایک اور صاحب ہیں کہ وہ بھی .... ہی کے مسترشد ہیں۔ ایک بار یہ فرمایا کہ اصل شے یاد اللہ ہے۔ نماز وغیرہ سب فرع ہیں۔ یہ بات دل کو کھٹکی۔ خیر انھوں نے پھر وضاحت کی جو اصل سے زیادہ دور نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن پھر بھی اس طرح کی بات احتیاط کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

(ج) اب اسے کیا کیا جائے کہ زبان میں ہر لفظ کے کئی کئی پہلو اور کئی کئی محل استعمال ہوتے ہیں۔ فرع میں ایک پہلو اصل کی ماتحتی اور اس سے کمتری کا نکلتا ہے۔ اس معنی میں نماز کسی دوسرے حکم کی فرع یا اس سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ لیکن ایک دوسرا تعلق اصل و فرع میں اجمال و تفصیل کا ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے نماز اور ساری ہی عبادتیں تفصیل ہیں اجمالی حکم یاد الٰہی یا ذکر اللہ کی۔

ایک اور تعبیر یہ بھی ممکن ہے کہ یاد الٰہی کو بجائے کسی ایک متعین حکم کے ایمان کی طرح ایک مخزن و مصدر کی جگہ پر رکھا جائے اور نماز وغیرہ مختلف دھارے اسی سرچشمے سے پھوٹتے ہوئے تسلیم کیے جائیں۔

بہر صورت نماز کے استخفاف کا کوئی پہلو نہ نکلنے پائے۔

(٢)

مؤمن کا جنّتی ہونا

(س) آنجناب نے اکثر زبانی بھی فرمایا اور صدق میں بھی بارہا آیا کہ جو اس عالم سے فوت ہو گیا اس سے ہم عنقریب ملیں گے۔ مگر اس میں تو شرط دونوں کے قابلِ نجات ہونے کی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کسی مسلمان کو اپنے یا کسی دوسرے مسلمان کے واسطے غیر ناجی سمجھنا ناجائز ہے مگر یقینی ناجی ہونا بھی تو غالباً مشتبہ ہے۔

(ج) اصل وطن اور جائداد ہر آدم زاد کی جنت ہی ہے۔ عام قاعدہ یہی ہے۔ جیسے دنیا میں ہر انسان کے لیے دو آنکھیں ہونا۔ کفر و شرک اس راہ میں خارجی موانع ہیں جیسے کوئی بچہ بغیر آنکھوں کے۔ یا صرف ایک آنکھ کے ساتھ پیدا ہو۔ عام بول چال میں ان مستثنیات کے باوجود فقرہ اپنی مطلق ہی صورت میں بولا جائے گا۔ یعنی یوں ہی کہ ہر انسان کے دو آنکھیں ہوتی ہیں ____ یقینی عرفِ عام میں جس معنی میں بولا جاتا ہے، اس میں ہر مومن کا جنتی ہونا یقینی ہے جس طرح دُنیا کی اور کوئی یقینی خبر۔ باقی یقین کی جو شرعی اصطلاح ہے۔ اس

معنی میں بے شک کسی کی نجات یقینی نہیں، بجز انبیاء معصومین کے، یا ان اشخاص کے جنہیں پیمبر اپنی زبان سے جنتی کہہ چکے ہوں۔

(س) میں اور میری بیوی ابھی تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوئے ہیں مگر یہ خلش روز افزوں ہوتی جا رہی ہے۔

(ج) بیعت میں بجائے عجلت کے خوب تلاش اور چھان بین بہتر ہوگی ــــ حسنِ ظن ہر صالح مسلمان سے رکھنا چاہیئے۔ لیکن اپنی اصلاح کے لیے اپنے کو سپرد اسی کے ہاتھ میں کرے جس کی اہلیت و صلاحیت پر طویل تجربہ و سابقہ کے بعد دل کو پورا بھروسہ ہو لے۔ اعتماد اس کی کثرتِ عبادت و زہد و ریاضت پر نہیں بلکہ اس کی اہلیت اصلاح و سیرت سازی پر۔ پھر ہر شخص کی مناسبتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔

(س) اگر جناب مخدوم ازراہِ عنایت کوئی مناسب و متبرک صاحب بصیرت شخص کا نام تجویز فرما دیں تو عنداللہ ماجور ہوں گے۔

(ج) ایسا شخص حتی الامکان اپنے جوار ہی میں تلاش کیا جائے تاکہ اس سے ملنا جلنا اور اس کی صحبت میں بیٹھنا آسان رہے۔ دور کے مرشد میں یہی دقت ہوتی ہے کہ سفر کر کے اس کے پاس طویل مدتِ قیام آسان نہیں ہوتی۔ یوں حیدر آباد دکن میں .... اصلاح کے کام میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں اور ماشاءاللہ عالم باعمل ہیں۔

(س) .... اسی کے ساتھ ساتھ حضور کے لیے دُعائیہ جملے نکلتے ہیں، اور زبان پر یہ جملے بھی آجایا کرتے ہیں کہ اس عاصی کا خاتمہ ایمان پر ہو اور میرا حشر حضور والا کے ساتھ ہو۔

(ج) اور دُعائیں تو خیر ٹھیک ہیں اور خود دعا کرنے والے کے لیے موجبِ اجر۔ باقی یہ آخری جزو بہت زیادہ مبالغہ پر مبنی ہے اور خطرناک بھی۔ کسی کو کیا خبر کہ میرا حشر کیا ہونے والا ہے اور ایک بدعمل تباہ کار کے حشر کا سہارا ڈھونڈھنا تو بڑی ہی نادانی ہے۔ بہترین صورت یہ ہے کہ وابستگی صرف رسول معصوم کے دامن کے ساتھ رکھی جائے اور دُعا کے الفاظ کچھ اس طرح کے ہوں کہ الٰہی! اس کمترین امت کا حشر رسولؐ مقبول کے خدام کے زمرہ میں ہو۔

(س) روزانہ معمولات میں صبح کی نماز یا ظہر کی نماز کے بعد ایک یا دو پارے قرآنِ مجید کے اور ایک قسط مناجاتِ مقبول کی آپ کی شرح والی بلاناغہ پڑھ لیتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

(ج) یہ معمولات جو بطور نفل یا مستحب کے ہوتے ہیں، ان سے مقصود محض حصول و ازدیادِ برکت ہے، جس سے جتنے بھی اپنی فرصت و ہمت کی مناسبت سے ہو سکیں، ان کی توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور برابر ان کی کیفیت کو ترقی دینے اور ان کی کمیت کو بڑھانے کی فکر میں لگے رہنا چاہیے۔ لیکن توجہ کی اصل اور مقدم شے اپنے کو نافرمانی کی زندگی یعنی معصیت سے بچانا ہے۔ توجہ و اہتمام کا اصلی مرکز اسی کو رکھنا چاہیے۔

(س) اب کی ماہ صیام میں کتنے کام کرنے کو اٹھا رکھے تھے۔ لیکن کئی دن سے علالتوں میں مبتلا ہوں۔ معمولی تلاوت کا بھی نباہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ خط بھی مشکل ہی سے لکھ رہا ہوں۔ ضرور دعائے صحت فرمائی جائے۔

(ج) اللہ شفا دے۔ لیکن یہ اپنے طے کردہ پروگرام سے معذوری بھی تو رحمت ہی ہے اب تکمیل بندہ کے بنائے ہوئے نہیں خدائی پروگرام کی ہوگی۔ رمضان کا حق ہم اہلِ دنیا کہاں ادا کر پاتے ہیں۔ یہ علالت انشاء اللہ ساری کوتاہیوں کی تلافی کردے گی۔

(س) پچھلے ہفتہ سے چھوٹی لڑکی سخت علیل ہوگئی ہے۔ اس سخت موسم میں روزہ یوں بھی آسان نہ تھا، اب یہ خانگی پریشانی اس پر مستزاد۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے۔

(ج) روزہ کی حالت میں یہ دوڑ دھوپ، تیمار داری وفکرمندی۔ مجاہدہ پر مجاہدہ۔ اللہ جلد شفا دے۔ لیکن یہ مجاہدات، اضطراری کی نعمت خود قابلِ شکر ہے۔ اسے صرف زبان سے اور رسماً ہی نہیں بلکہ دل سے محسوس کیا جائے۔

(۳)

دُنیاوی تجربے

(ایک مشہور درس گاہ سے تعلق رکھنے والے کا مکتوب)

(س) بہت دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، لیکن سستی طاری رہی۔ جولائی میں کچھ عزیزوں کے داخلے وغیرہ میں مصروف رہا۔ کچھ ایسے کام بھی رہے جس میں کچھ لوگوں سے کہنے سننے کی بھی ضرورت پڑی اور آخر کار مایوسی۔ اس کا بھی ردِ عمل طبیعت پر زیادہ رہا۔

(ج) یہ تجربے دُنیا میں ہوتے رہنے بھی قدرتی ہیں اور ان سے طبیعت پر یہ ردعمل بھی قدرتی۔

(س) تجربہ یہ ہوا کہ اس قسم کی ذمہ داری اپنے سر لینی ہی نہ چاہیئے۔

(ج) ٹھیک ہے۔

(س) اس میں احتیاط تو پہلے بھی رکھتا تھا، لیکن بعض قریبی عزیزوں کی خاطر یہ سب کرنے کی بھی مجبوری رہتی ہی ہے۔ جو نقطہ نظر اپنا ہوتا ہے، اور انہیں سمجھانا مشکل ہوتا ہے اور خیال ان کی خاطر شکنی کا ہوتا ہے۔

(ج) یہ بھی بالکل ٹھیک۔

(س) چھٹیوں میں والدہ ماجدہ سے قریب رہنے کا اتفاق زیادہ رہا، ان کی بیماری اور تکلیف سے دل پر کافی اثر رہتا تھا اور قلب کا رجحان اللہ سے عاجزی اور انکساری کی طرف خصوصی طور سے رہتا تھا۔

(ج) ابتلاء سے یہی تو عین مقصود ہوتا ہے۔

(س) کبھی کبھی طبیعت میں ایک طرح کی گرانی محسوس ہوتی تھی اور مناسب تحریک سے گریہ بھی طاری ہوتا تھا۔

(ج) ع اے خنک چشمے کہ آن گریان اوست

(س) یہاں آنے پر مکروہات میں ایسا الجھا کہ وہ کیفیت نہ رہی۔

(ج) بالکل ایک امر طبعی ہے۔

(س) یوں وقتاً فوقتاً ایسا ہوتا ہے کہ کسی نامعلوم وجہ سے دل پر ایک طرح کا بوجھ سا محسوس ہوتا ہے اور تلاوت میں کسی خاص آیت کے تاثر سے یا رسول کریمؐ یا صحابۂ کرام رضؓ کی زندگی کے کسی واقعہ کی طرف خیال جاتا ہے۔ کبھی کبھی نماز میں بھی گریہ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور طبیعت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے۔

(ج) سب مبارک آثار ہیں۔ ماشاء اللہ۔

(س) ایسے موقعوں پر آنجناب کی طرف بھی خیال جاتا ہے۔

(ج) تمامتر نتیجہ محبت و حسن ظن کا ہے جو ہر نا اہل و ناکارہ سے متعلق بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔

(س) لیکن یہ حالت پیش شاذ و نادر ہی آتی ہے۔

(ج) کچھ مضائقہ نہیں۔ دوامِ کیفیت تو اچھے اچھے پختہ کاروں کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

(س) زندگی یوں میری بہت ابتر ہے۔

(ج) یہ ابتری کا احساس بھی انشاءاللہ بہتری کی طرف لے جائے گا۔

(س) زیادہ پریشانی جس سے ہوتی ہے وہ اخلاقی ذمائم ہیں۔ مثلاً کسی کی برائی پر ذراسی تحریک پر سخت کلامی بلکہ بدکلامی سے نہ چوکنا، دوسروں کی کمی، کوتاہی پر محض اس کی کوتاہی ثابت کرنے کے لیے گرفت کی نظر کڑی رکھنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں غیبت سے بھی چھٹکارا نہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جوش ختم ہونے پر محسوس یہی ہوتا ہے کہ دل کا غبار چھٹا نہیں بلکہ بڑھ ہی گیا ہے۔ محرکات اس کے عام طور پر یہی ہوتے ہیں کہ کوئی ملا اس نے بات چھیڑ دی پھر کیا ہے۔ دیکھیے انداز گل افشانی گفتار۔ اس کا ردعمل یہی ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ زباں بالکل بند کرلی جائے۔ لیکن یہ بات وقتی تاثر سے آگے نہیں بڑھتی۔

(ج) ان میں سے کوئی چیز بھی نہ غیر طبعی ہے نہ معمول عام کے خلاف۔ توجہ اگر قائم ہے تو انشاءاللہ یہی حال ایک دن مقام بن جائے گا۔ نفس امارہ پر نفسِ لوامہ کو بالادستی بحمداللہ اب بھی حاصل ہے، اور یہ زینہ ہے نفسِ مطمئنہ کے حصول کا۔

(س) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبر و تسلیم کی منزل تک رسائی صحیح معنوں میں بہت کچھ مسافت طے کرنے کے بعد ہوتی ہے۔

(ج) یہ تو ظاہر ہی ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ ..... الخ (العنکبوت۔ آیت اول) لیکن مایوسی یا بدہمتی کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی موجود نہیں۔ اجر منزل کے ہر ہر قدم پر ملتا رہتا ہے، اور ترقی کے ہر درجہ پر برابر درج رجسٹر

ہوتے رہتے ہیں۔

(س) حضرت تھانوی رح کا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا، اس میں ایک جگہ یہ ہے کہ "فکرِ لایعنی سے قلب کا ستیاناس ہو جاتا ہے"۔ اس میں بہت بڑی تنبیہ نظر آئی۔

(ج) بے شک۔

(س) فکرِ لایعنی کا مفہوم کچھ نہ کچھ تو ذہن میں متعین کر ہی لیا ہے لیکن اس کی کوئی جامع تعریف ارشاد فرمادیں تو اس سے کچھ نفع حاصل کروں۔

(ج) محض گپ بازی۔ گپ شپ محض گپ شپ کی خاطر۔ ایسا موضوع گفتگو جو دینی و اُخروی کیا کسی دُنیوی ضرورت سے بھی متعلق نہ ہو۔ زیادہ فضول گوئی۔

عارف رومی کی زبان میں ؎

دل زپر گفتن بمیرد در بدن
گرچہ گفتارت بود دُرِّ عدن

کم خوری، کم خوابی، کم گوئی میں اہم ترین اور سب سے زیادہ ضروری کم گوئی ہی ہے۔

(س) آنجناب کی خیر و عافیت کے لیے دُعا کرتا ہوں۔

(ج) جزاک اللہ۔

(۴)

مذہب کی اہمیت

(س) (ایک جدید تعلیم یافتہ واردِ امریکا کے قلم سے)

لوگ مذہب کو out of Date کہتے ہیں اور عبادات کو رسم قرار دیتے ہیں، مگر میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تو یہ ہے کہ نماز اور ذکر کی حلاوت اور اہمیت کا صحیح اندازہ آج کے گہما گہمی کے ماحول میں ہوتا ہے جبکہ زندگی کی کشمکش نے وہ شدت اختیار کرلی ہے کہ انسان محض مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ تب نماز اور ذکر ہی اس کی شخصیت کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور ہم نماز کی مدد سے اس میکانکی ماحول سے کبھی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں آج Neurotics (عصبی امراض) کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ زندگی میں جو Tension (کھنچاؤ یا تناؤ) آج پیدا ہوگیا ہے اس کو Relieve کرنے (ڈھیلا کرنے) کا نماز ایک موثر ذریعہ ہے۔

(ج) عین حق وصواب ہے

(س) میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ لنچ کے وقفہ میں ایک پیالی چائے یا کافی کے

عوض صحیح طریقہ سے وضو کر کے خضوع و خشوع سے پڑھی گئی نماز زیادہ Relaxation (تفریح و انبساط) کا سبب ہوتی ہے۔

(ج) پورا خشوع و خضوع ہم لوگوں کے نصیب میں کہاں؟ معمولی اور اوسط درجہ کی توجہ کے ساتھ ہی اگر نماز ادا کر لی جائے تو ہر مفرح و مسکن دوا کا نعم البدل ثابت ہو جائے گی ____ محض اعتقاداً اسے نہ مانا جائے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔

(س) رات بارہ بجے شکاگو پہنچا۔ جہاز راستہ میں بیروت، روم، پیرس اور نیویارک ٹھہرتا ہوا آیا، اجنبیت مجھے کہیں بھی محسوس نہیں ہوئی۔ دو ایک صاحبوں سے ذکر آیا تو میں نے کہہ دیا کہ جو لوگ نسل انسانی کو ایک برادری مانتے ہیں انھیں اجنبیت کہیں محسوس نہیں ہوتی۔

(ج) اور یہ کہہ کر آپ نے اقبالؔ کے مصرعہ کی بہترین شرح کر دی ع

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

رب العالمین کے پرستاروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ اس جذبہ کی قدر وہ غریب کیا کر سکتے ہیں جن کے بلند سے بلند حوصلے محدود ہیں۔ انگلستان پرستی، ہندوستان پرستی، پاکستان پرستی، عرب پرستی تک۔!

(س) رات جو خاتون اسٹیشن سے کیمپ لا رہی تھیں انھوں نے پوچھا کہ یہاں کی دنیا تم کو بالکل مختلف معلوم ہو رہی ہوگی؟ میں نے کہا کہ ظاہری اختلافات میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور جہاں تک بنیادی انسانی اوصاف کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہر جگہ ایک ہیں۔ انسان کے جذبات خواہشات، اُمنگیں اور آرزوئیں مشرق اور مغرب میں بدل نہیں جاتیں۔

(ج) یہ بھی آپ نے گویا بلیغ ترجمانی کر دی ۔ لِلّٰہِ الْمُشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ

اور رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَالْمَغْرِبَيْنِ اور دوسری آیات قرآنی کی۔

(س) ابھی صبح ہے اور میں بہ عجلت یہ خط پورا کر رہا ہوں۔ کمرہ کے پانچ اور ساتھی ابھی سو رہے ہیں ...... یہ سماجی کارکنوں کا اجتماع ہے۔ میری شرکت یوں ہے کہ فرائض منصبی کے بعد میرا یہی مشغلہ ہے۔ ایک جماعت "یوتھ مومنٹ" کے نام سے ہے جس کا میں سوشل ویلفیر سکریٹری ہوں۔ ہمارے خاص مقاصد دار المطالعہ، لائبریری اور اسپورٹس سنٹر کا قیام ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ باشعور اور بامقصد زندگی گزارنے کے عادی ہوں۔ میرے نزدیک مابعد تقسیم کی خرابیوں کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہم میں بے مقصدی پیدا ہو گئی ہے۔

(ج) تشخیص صحیح ہے اور انتہائی افسوس ناک بھی۔ اس لیے کہ ہم تو بلند ترین مقصد کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ وَجَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً۔ ساری دنیا کی اصلاح کرنے اور کل خلائق کو دعوتِ توحید دینے۔

مغربی قوموں نے تو بہر حال کوئی مقصدِ حیات اپنے پیش نظر رکھ لیا ہے گو وہ بہت اعلیٰ نہیں، نسبتاً پست ہی ہے۔ مثلاً وطن پرستی یا قوم پرستی۔ باقی سرے سے تن پرستی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے کی امتیازی ذلت ہمارے ہی حصے میں آئی ہے۔ افراد کے استثنا سے ملت کی عمومی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

(س) یہاں علاوہ اور چیزوں کے صدق کی کمی بہت محسوس ہو گی لیکن قیام محض چند ماہ کا ہو گا اور وہ بھی ایک جگہ نہیں، اسلئے یہاں کا پتہ تحریر نہیں کیا۔

(ج) دل اگر اس سے اچھے مشغلوں میں مصروف رہے تو صدق، کاغذی کی کمی ان شاء اللہ کچھ زیادہ محسوس نہ ہونے پائے گی۔

⑤

نفلی روزہ

(س) اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے توفیق عنایت فرمائی ہے کہ فرض عبادت کے علاوہ نفل عبادت بھی تھوڑی بہت ہو جاتی ہے۔

(ج) الحمد للہ۔

(س) نفل روزہ سے متعلق جو حدیث شریف میں ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں رکھنا چاہیئے۔ لیکن میرا دل بے حد چاہتا ہے کہ کم از کم محرم، ذی الحجہ وغیرہ مہینوں کی جو مخصوص تاریخیں ہیں، ان میں تو ضرور ہی روزہ رکھ لیا کروں۔ لیکن وہ (شوہر) اس کے حق میں نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ روزہ رکھ کر کچھ تکلیف ہو جائے گی تو اس سے ان کو پریشانی ہو جائے گی۔ تو ایسی حالت میں مجھ کو نفل روزہ جائز ہے یا نہیں۔

(ج) جواز فقہی کے لیے تو دو رائیں ممکن ہیں۔ لیکن علمی مشورہ ایسی صورت میں نہ رکھنے ہی کا ہے۔ شوہر اگر کسی حقیقی یا وہمی نقصان کی بنا پر اس سے روک رہے ہیں تو عمل انہی کی رائے پر بہتر ہوگا۔ باقی اپنی نیت، ارادہ اور حسرت کا اجر تو کہیں گیا ہی نہیں ہے۔ انشاءاللہ ضرور ملے گا۔ اور ساتھ ہی حکمت و دانائی

کے ساتھ شوہر سے اجازت لے لینے کی کوشش برابر جاری رہے۔

(س) میرا دل چاہتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن مقرر کرکے محلہ کی عورتوں کو کچھ وقت کے لیے بلاؤں اور مواعظ حضرت تھانوی رح اور نماز روزے کے مسائل سے متعلق جو ایسی ترغیبی کتابیں ہیں (جیسے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی کتابیں) اس طرح سب کو سناؤں۔ کچھ نہ کچھ فائدہ ہوگا۔

(ج) خیال ہر طرح مبارک ہے۔ مولانا منظور نعمانی کی کتابوں کے علاوہ لکھنؤ کا ماہنامہ رضوان، بھی اس حیثیت سے بہت مفید ہوگا۔

(س) لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں دو باتیں مانع ہیں۔ ایک تو گھر کی مصروفیات دوسرے پہلے پہل شروع کرنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔

(ج) ہفتہ بھر میں صرف ایک دن۔ آدھ گھنٹے کا وقت نکال لینے کا اگر انتظام کرلیا جائے تو یہ کچھ ایسا دشوار تو نہیں معلوم ہوتا۔ رہا دوسرا مانع، تو بالکل شروع میں سننے والوں کی تعداد بالکل ہی مختصر و محدود رکھی جائے۔ دو ایک کی تعداد بھی کافی ہوگی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں مشق ہوتی جائے گی مجمع بھی بڑھتا جائے گا۔

(س) رمضان شریف میں میں نے محفل ذکر میں "برکاتِ رمضان" سے کچھ پڑھ کر سنایا تھا تو سب نے بہت پسند کیا۔ صرف ایک بات تھی کہ اس میں اُردو ذرا مشکل ہے اور یہاں کی عورتوں کے معیار سے اونچی۔ اس کے لیے میں نے سوچا تھا کہ اس کو عام فہم اُردو میں لکھ کر سب کو دے دوں۔ لیکن پھر مصروفیات کی بنا پر یہ نہ ہوسکا۔

(ج) رائے درست تھی۔
لیکن اگر ممکن ہو تو "اونچے" طبقہ میں تبلیغ کی ضرورت اس سے اشد ہے۔

بے حیائی، آوارگی، فحش پسندی، بے اعتقادی بلکہ نیم ارتداد کا جو فتنہ "بیگمات" تک پہنچ چکا ہے وہ شدید ترین ہے اور فوری توجہ کا محتاج۔ اس طبقہ تک پہنچنے کے لیے مولانا مودودی کی تحریریں بہت بہتر ہوں گی۔

(س) اب بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں، اس لیے ارادہ ہے کہ کوئی عالم بزرگ ایسے مل جائیں، جن سے میں اور میرے بچے ترجمۂ قرآنِ پاک پڑھ لیں۔ اس لیے کہ حضرت تھانویؒ نے اپنے مواعظ میں بار بار فرمایا ہے کہ ترجمہ قرآن کسی مستند عالم سے پڑھنا چاہیئے۔ آپ اس شہر کے کسی ایسے بزرگ عالم کا نام اور پتہ تحریر فرمادیں تو عین شفقت و نوازش ہوگی۔

(ج) آپ کے شہر کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ایک ایسے ہی عالم ہیں۔ انھیں اگر خود فرصت نہیں ہوئی تو اپنے کسی شاگرد سے یہ کام کرا سکتے ہیں۔

آپ ہی کے شہر میں ایک اور صاحب رہتے ہیں۔ بہ ظاہر دنیادار عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ، کسی سرکاری محکمہ میں عہدہ دار۔ لیکن علم شریعت و علم طریقت دونوں کے جامع۔ بڑے سعید و صالح مولانا سید سلیمان ندوی کے خلیفہ (اور اسی طرح بالواسطہ حضرت تھانویؒ کے بھی خلیفہ) ماہنامہ بینات کے محرر خصوصی، قرآن آموزی اور تربیت و اصلاح کے کام کے اہل۔ نام شاہ غلام محمد۔ پتہ ۲۶/۲ مارٹن کوارٹرز۔ کراچی ۵

(۶)

وساوسِ شیطانی

(س) (تین صفحہ کا لمبا چوڑا خط، جس کا لب ولباب یہ ہے کہ مجھے ذاتِ سرورِ کائنات سے بے انتہا عقیدت تھی اور ہے ــــــ اور اسی کو سرمایۂ زندگی سمجھتا ہوں۔ ایک ماہ بیشتر سے تصور میں یہ جم گیا ہے کہ مجھ سے کچھ گستاخیاں حضور کی شانِ اقدس میں سرزد ہوگئی ہیں۔ بس جب سے دل قابو میں نہیں ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ دماغ جواب دے گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ضعفِ اعصاب کا شکار ہوں۔ غرض بڑی ہی بُری حالت ہے۔ بشر نجات دلوائیے)

(ج) جب عقیدت شعوری طور پر بحمد اللہ بدستور قائم ہے تو گستاخی کا یہ واہمہ تمام تر ایک وسوسۂ شیطانی ہے، اس پر لاحول پڑھ کر اپنے کام میں حسبِ دستور لگے رہیے اور اس وسوسہ پر اصلاً التفات نہ کیجیے۔ شیطان آپ کو غیر ملتفت پا کر مایوس ہو کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ اس کی جانب التفات و توجہ رکھنا ایک سفلہ کو منھ لگانا اور سر پر چڑھانا ہے۔

اور ضعفِ اعصاب و ضعفِ قلب کا طبّی علاج بھی جاری رکھا جائے

آپ کے طول طویل خط کا مختصر و موثر علاج بس یہی ہے کہ وسوسہ

سے اپنی عملی زندگی میں ہرگز کسی درجہ میں بھی اثر نہ لیجیے۔

(س) آنجناب سے رخصت ہوکر دوسرے دن بخیریت تمام وطن پہنچ گیا۔ آنجناب کی صحبت اور صاف وسیدھی تعلیمات کا دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کیا عرض کروں۔ زندگی کی بہت سی باتیں اور لگاوٹیں بے حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ زندگی اور آخرت کی صاف اور کھلی ہوئی حقیقتیں جو ہر فعل وعمل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن عام طور سے جن کی طرف سے غفلت رہتی ہے، کھل کر سامنے آتی ہیں۔ عمل کی کوشش میں بھی رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندگی سنوار دیں اور بندہ کا تعلق اپنے آپ ہی سے قائم رکھنے میں اس کی مدد کریں اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے رہیں۔

(ج) آمین! اور ہر لحظہ وہر آن اصلاح حال کی بھی توفیق بخشتے رہیں۔ باقی یہ جو کچھ بھی ہے اگر حسن ظن کے بعد کچھ حقیقت بھی رکھتا ہے تمامتر فیض تھانہ بھون کے بڑے میاں ہی کا ہے۔ حقائق کی ترجمانی میں ملکہ رکھتے تھے اور پھر انھیں حیرت انگیز حد تک سہل وآسان بناکر۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ دین کبھی کوئی ایسی مہیب ودشوار چیز ہے جس سے وحشت اور دہشت کی جائے بلکہ زندگی کو بس سہل سادہ اور فطری طریقہ پر گزارنے ہی کا نام دین ہے۔ اور کسی سلیم الفطرت کو بھی اس سے گھبرانے وہول کھانے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ الٹا عین التفات اور رغبت ہی اس طرف ہونی چاہیے۔

زندگی نام نہ کسی دقیق وغامض فلسفہ میں در آنے اور اس کے اسرار و

رموز کے سلجھانے کا ہے اور نہ اپنے اوپر سارے مرغوبات ومالوفات کے حرام کر لینے کا بلکہ خالق ومخلوق دونوں کے صحیح تعلقات کو سمجھ جانے اور ان کے بڑھنے کا نام ہے۔ اور اسلام وہی ہے جو زندگی کو یہ نظام عطا کرتا ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کا دعویٰ ادل بدل کر قرآن و سُنّتِ رسُول ؐ نے بار بار پیش کیا ہے۔

(س) احقر جامعہ ...... کا سند یافتہ ہے۔ مدرسہ کے نصاب کے علاوہ .... یونیورسٹی کا عربی امتحان ..... بھی پاس کیا ہے۔ انگریزی سے بھی مس ہے۔ علی گڑھ سے انگریزی .... کیا ہے۔ دلی تمنّا ہے کہ علمی زندگی گزاروں۔ نری علمی وتصنیفی زندگی نہیں بلکہ ایسی زندگی جس میں اور جس سے بساط بھر اسلام کی خدمت کی جا سکے۔

(ج) حُسن نیت بڑی چیز ہے۔ اللہ یہ دولت مُبارک کرے۔

(س) اس مقصد کی خاطر ایک ادارہ سے وابستگی کی سوچ رہا ہوں۔ اب آپ سے اس امر کی تصریح چاہتا ہوں کہ کس فن کے ذریعہ اسلام کی خدمت بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔

(ج) خود ہی اپنے ذوقِ استعداد وحالات کی مناسبت سے اگر دو چار فنون کے نام لکھ بھیجیں تو مشورہ دینے میں آسانی ہو جائے۔

(س) اور دُنیا خصوصاً ہندوستان کے سامنے اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کے لیے کون سی زبان زیادہ مفید و متاثر اور بار آور ہے

(ج) انگریزی، اُردو، ہندی تینوں زبانوں میں کام کی بڑی گنجائش ہے

(۷)

مسئلہ جبر و اختیار

(س) خدا کے وجود سے متعلق آپ کے فلسفیانہ جواب سے فیض یاب ہوا...
..... آج پھر ایک سوال خدا کے فضل کے متعلق ارسال خدمت ہے۔
خدائے عزّ و جل اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے: قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی مشرک و ملحد کو ایمان کی روشنی عطا کرنا، یہ بھی خدائے عزّ و جل کے خاص فضل و کرم میں سے ہے۔ چونکہ وہ مقلب القلوب بھی ہے اور اپنے فضل و کرم سے مستفیض کرنا چاہے تو روئے زمین کے کل مشرکوں، کافروں اور ملحدوں کے قلوب کو پھیر کر ان کے قلب کو ایمان کی روشنی سے منور کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے فضل سے محروم رکھنا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی۔ ایسی صورت میں مجبور بندہ کا قصور ہی کیا جو جہنم کا مستحق بنے؟

(ج) سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ باوجود قدرت کے ہدایت سب کو عطا کیوں نہیں کر دیتا! ــــ جبر و اختیار کا یہ بڑا پرانا اور مشہور سوال ہے۔ صدق میں اس کا جواب بڑی تفصیل سے اور پھر مختصر کئی بار نکل چکا ہے۔ پرانی فائلوں میں

مل جائے گا.

سائل ایک عملِ خداوندی کی مصلحت جاننا چاہتا ہے لیکن ذرا سوچ لے کر یہ سوال کبھی بھی اور کسی منزل پر بھی پہنچ کر ختم ہونے والا ہے ؟ جو بھی مصلحت بیان کی جائے خود اس مصلحت پر بھی بعینہٖ یہی سوال عائد ہو جائے گا کہ یہ مصلحت کیوں رکھی گئی ہے ؟ اس مصلحت کی کیا مصلحت ہے ؟ سوال جس طرح ذاتِ باری سے متعلق ختم ہونے والا نہ تھا ٹھیک اسی طرح کسی مصلحت و حکمت خداوندی سے متعلق بھی ختم ہونے والا نہیں، ہر مصلحت کی مصلحت، ہر حکمت کی حکمت مسلسل نکلتی چلی آئے گی۔ انقطاع و اختتام کسی منزل پر بھی نصیب نہ ہوگا ــــــ اسے خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

تو اب عقل کا تقاضا کیا ہے ؟ دو چار، دس بیس منزلوں کے بعد ہار کر اور تھک کر جو خاموشی اختیار کرنا ہوگی اسے پہلے ہی کیوں نہ اختیار کر لیا جائے ؟

ثواب و عذاب، نیکی و بدی، خیر و شر۔ اس دنیا میں جو کچھ ہے سب کی بنیاد انسان کی قوتِ انتخاب و اختیار ہی پر ہے۔ اس بنیادی و مرکزی حقیقت کو ذہن میں اُتار لیا جائے۔ اگر انسان میں یہ قوت موجود نہ ہو تو وہ مجبور ہے کہ فلاں متعین راستہ ہی کو اختیار کرے اور اس صورت میں انسان اور ایک بے جان مشین بالکل برابر ہیں اور جب انسان سلب و ارادہ کے بعد، مشین کی طرح بے بس و مجبور ہو گیا تو اب اس کے لیے نیکی بدی، ثواب و عذاب خیر و شر کے کوئی معنی ہی نہیں رہے جیسے کوئی متقی کرسی اور صالح دیوار

اور نیک میںز کوئی معنی ہی نہیں رکھتی ــــــ جانوروں، چھوٹے بچوں، پاگلوں پر کوئی سوال وجواب اسی لیے تو نہیں کہ وہ ارادہ سے معریٰ اور قوتِ انتخاب سے محروم ہیں۔

اب اگر اللہ ہر انسان کو ہدایت لازمی طور پر دے رہا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ بندے سے اس کا ارادہ و اختیار چھن گیا۔ وہ ہدایت کی متعین راہ کے لیے مجبور و مضطر بنا دیا گیا اور بری کی صلاحیت ہی اس سے سلب کرلی گئی۔ اس صورت میں نیکی، نیکی باقی ہی کب رہی؟ وہ تو سانس لینے اور حرکتِ قلب کی طرح کی ایک اضطراری اور لازمی چیز جزوِ زندگی بن گئی۔!

پھر ذرا اس کو بھی ذہن کے سامنے لے آئیے کہ عملاً یہ صورت حال اس دنیا میں ممکن کیونکر ہے؟ جب کوئی ظالم و مظلوم سرے سے باقی ہی نہ رہا تو دادرسی کس کی؟ اور فیصلہ کس کے درمیان؟ عدالتیں چھوٹی بڑی کوئی بھی باقی رہ سکیں گی! ــــــ جب کوئی چور، ڈاکو، لٹیرا، قاتل، زناکار، جعل ساز وغیرہ پایا ہی نہ جائے گا تو گواہ، قاضی، پولیس، فوج میں سے کسی چیز کا بھی وجود رہ سکے گا؟ حاکم و محکوم، افسر و ماتحت کے سارے ہی امتیازات فنا ہو جائیں گے اور جیل اور شفاخانے کی طرح جنت و دوزخ سب کا وجود بے کار ہی ہو کر رہ جائے گا۔ پیمبروں کی بعثت، کتبِ آسمانی کا نزول، ان کی شرح و تفسیر واعظوں کا وعظ، عالموں کی تبلیغ سب تحصیلِ لاحاصل کے درجہ میں ہوں گی۔ اس لیے کہ ہر شخص لازمی طور پر ہدایت یاب ہی ہو گا ــــــ غرض لزومِ ہدایت کے فرض کے بعد عقلِ انسانی میں ہرگز نہیں آتا کہ دنیا کا نقشہ کیا سے کیا ہو کر رہے گا۔

سارا دھوکا مشیتِ خداوندی اور حکمِ خداوندی کے درمیان فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھ لینے سے پیدا ہو گیا ہے ۔۔۔ پہلی چیز مرادف ہے علمِ خداوندی اور اس کے مطابق نقشۂ تکوینی کے، اور دوسری چیز مرادف ہے مرضیاتِ الٰہی اور ہدایاتِ تشریعی کے۔ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے نہ معارض و منافی ہیں نہ ایک دوسرے کی شریک و معین، نہ باہم مل جل کر رہنے والی نہ باہم لڑ بھڑ کے بلکہ ایک دوسرے کے متوازی اپنے اپنے خطوط پر چلنے والی۔

اب یہاں پہنچ کر مثال کے لیے ایک طبیبِ حاذق کو سامنے لائیے۔ اس کا علم مستقل بھی کامل اور اس کے نسخے بھی بے خطا۔ مریض سے وہ بار بار تاکید پرہیز و احتیاط کی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ خوب واقف ہے کہ مریض ان ہدایتوں پر عمل نہیں کر رہا ہے اس لیے ہلاکت یقینی ہے اور اس انجام کی پیش گوئی بھی وہ جزم و یقین کے ساتھ کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انجام میں طبیب کی مرضی یا خواہش کو مطلق دخل نہیں بلکہ یہ انجام تو عین اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی عدول حکمی کا ثمرہ ہے۔

اللہ کا حکم اور اس کی رضا یہی ہے کہ ہر بندہ توحید و عمل صالح اختیار کرے۔ لیکن اپنے علم کامل سے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو بندہ اپنی قوتِ ارادی و انتخاب کے غلط استعمال سے راہِ شرک و معصیت پر چلے گا اس کا انجام جہنم ہی ہے۔ یہ نتیجہ اللہ کی مرضی اور تعمیلِ احکام کے عین خلاف، اور اس کے قانون تکوینی و مشیتی کے ماتحت ہو گا۔

(س) (ایک بی۔ ایس سی وغیرہ کے قلم سے)، آج کل طبیعت میں ایسی کتابوں کے مطالعہ کا رجحان پیدا ہو رہا ہے جس سے اسلامی عقائد و اعمال کی ہم آہنگی فطرت سے ثابت ہو اور مباحث اس سلسلے میں تازہ اور up to date ہوں۔

(ج) رجحان مبارک ہے۔ گو معاملہ ذرا دو دھاری تلوار کا سا ہے۔ جن کا ایمان خوب راسخ و استوار نہیں ہو چکا ہوتا ہے ان کے لیے یہ راہ خطرناک ہی ہے۔

(س) ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی کتاب "قرآن و علم جدید" ایک بار دیکھ گیا ہوں۔ لیکن اسے دوبارہ سہ بارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

(ج) بے شک کتاب بہت غور سے، اور صرف بہت اونچی استعداد والوں کے پڑھنے کے لیے ہے۔

(س) یہ کتاب ایمان پرور اور بصیرت افروز معلوم ہو رہی ہے۔

(ج) بے شک ہے۔ مگر صرف خواص بلکہ کہنا چاہیے کہ اخص خواص کے لیے۔

(س) لیکن اس کے مباحث میں کلام پاک کی بعض آیتوں مثلاً تخلیق آدم کی آیتوں کی جو تفسیر کی گئی ہے، وہ علماء کے نزدیک تفسیر بالرائے کے حکم میں تو نہیں آتی؟

(ج) ان تعبیرات کو تفسیر سمجھ کر نہ پڑھا جائے۔ تفسیر تو وہ ہے جو قرآن کا اصل مفہوم و مدلول اس کلام کے سیاق میں بیان کرے۔ باقی یہ تو "اعتبارات" ہیں۔ یعنی ضمنی پہلو، جو ان آیات کی روشنی میں نکل آتے ہیں اور جب تک کسی قاعدۂ عربیت سے کسی مسلمہ دینی کے معارض نہ ہوں، قبول کیے جا سکتے ہیں۔ حضرات صوفیاء، خصوصاً مولانائے روم نے ایسے اعتبارات سے بکثرت

کام لیا ہے اور خوب خوب نتائج پیدا کیے ہیں ــــــــ تفسیر بالرائے وہ ہے جو قواعد عربیت یا مسلمات دینی کے منافی ہو۔

(س) تفسیر میں تفسیر بالرائے کی کیا حیثیت ہے۔؟

(ج) وہی جو ایک مستند تحریر کے سامنے ایک جعلی نوشتے کی ہوتی ہے۔

(۸)

علائقِ دنیوی سے علیحدگی

(س) خدمت عالی میں عریضہ مدت کے بعد تحریر کر رہا ہوں۔ عام طور سے زحمت اسی وقت دیتا ہوں جب کوئی خاص بات ہوتی ہے۔

(ج) بالکل صحیح راہِ عمل ہے۔

(س) لیکن عرصہ اگر زیادہ گزر جائے تو یوں بھی خلش محسوس ہونے لگتی ہے۔

(ج) یہ بھی بالکل قدرتی ہے۔

(س) چھٹیاں وطن میں گزری تھیں اور وہیں چند کتابیں مطالعہ میں رہیں۔ "وقارِ حیات" اور "تذکرۂ محسن" بھی دیکھ گیا۔ مقصود اس سے یہ معلوم کرنا تھا کہ علی گڑھ دورِ اوّل میں کیا تھا۔ خاص طور پر مذہبی ماحول اور طلبا کی عام زندگی کیسی تھی، ان کی تربیت کس انداز پر ہوتی تھی اور ان کے احساس و افکار عموماً کیا ہوتے تھے۔ مگر جیسا کہ آنجناب نے فرمایا تھا، اندازہ یہی ہوا کہ محض ان تذکروں سے اس دور کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکتی۔

(ج) سبق آموزی ان کتابوں سے مقصود ہی نہ تھی۔ اصلاً منقبت نگاری مقصود تھی جذبۂ عقیدت کے ماتحت "وقارِ حیات" تو پھر غنیمت ہے۔ "تذکرۂ محسن" اس

سے زیادہ سطحی ہے۔

(س) ایک مختصر سی انگریزی کتاب پاکستان کے بشیر احمد ڈار کی "Quranic Ethics" بھی مطالعہ میں آئی۔ یہ کتاب اچھی معلوم ہوئی۔

(ج) جی ہاں۔ خاصی ہے۔ اپنے حدود کے اندر مفید ہے۔

(س) صدق کے پرانے فائل بھی الٹتا پلٹتا رہا۔ واقعہ اب یہی ہے کہ حیات اور آخرت کی بظاہر چھوٹی اور سچی باتوں میں طبیعت لگتی ہے۔

(ج) الحمدللہ۔ یہ ایک نعمت ہے۔

(س) فلسفیانہ مباحث میں نہیں لگتی ہے۔

(ج) فلسفہ صرف لفظوں اور اصطلاحوں کا گورکھ دھندا ہے۔ حقائق سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

(س) "بشریت انبیاء" بھی انھیں دنوں دیکھی اور تاثر یہ قائم ہوا کہ انبیاء کرام کی بشریت و عبدیت کی حقیقت ان کی عظمت و محبّت کو دل میں اور بڑھا ہی دیتی ہے، کم نہیں کرتی اور خود اپنے دل میں عبدیت کا احساس زور پکڑتا ہے جو خود انبیاء کرام کے مشن کا اصل ہے۔

(ج) یہ فہم سلیم بہت ہی قابلِ شکر ہے۔

(س) "مناجاتِ مقبول" میں آنجناب کے حواشی و تفسیر نے دل پر جو اثر کیا تھا، کچھ ویسا ہی اثر اس کتاب کے مطالعہ نے بھی کیا۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ایسی مخلصانہ و مؤثر خدمت کرنے والے کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ موقع اس سے مستفیض ہونے کا ہم عاصیوں کو عطا فرمائے۔

(ج) ایسے مخلصوں کی دعائیں ہی اپنا اصل سرمایۂ سعادت ہیں۔

(س) .... اب اسکول ہی کی عمارت کے ایک کمرے میں اُٹھ آیا ہوں۔ کمرہ معمولی اور مختصر سا ہے لیکن یہاں تنہائی اور یکسوئی رہتی ہے جو طبیعت کو بہت پسند ہے۔

(ج) مُبارک علامت ہے۔

(س) خواہش اب یہی رہتی ہے کہ دل بے جا علائقِ دنیوی سے رفتہ رفتہ پاک ہوتا جائے اور اس کی جگہ تعلق اللہ تعالیٰ سے بڑھتا جائے۔

(ج) ان شاء اللہ یہی ہوگا بھی۔ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ؕ

(س) اس کی تھوڑی بہت فکر بھی کرتا ہوں اور معاصی سے بچنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن نفسانیت اکثر گفتگو و معاملات میں غالب آجاتی ہے جس سے بعد میں افسوس و ندامت بھی ہوتی ہے۔

(ج) اس انفعالی کیفیت محمود کے ساتھ ساتھ اگر بہ قدر امکان عملی تدارک بھی ہوتا رہے تو نورٌ علیٰ نور ــــ نفسِ معصیت سے جب حضرت آدمؑ نہ محفوظ رہ سکے تو ہم دنیادار آدم زادوں کا کیا ذکر ہے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الخ

(س) نماز کی توفیق تو خیر جوں توں پابندی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ لیکن نماز میں جی نہیں لگتا اور کوئی کیفیت خشوع وخضوع کی نہیں پیدا ہوتی۔ از راہِ کرم ضرور اس کا کوئی علاج بتائیں۔

(ج) اندھے کی رہنمائی کوئی اندھا کیا کر سکتا ہے۔ مریض کا علاج وہ کیسے کر سکتا

ہے جو خود بھی اسی مرض کا مریض ہو۔ کاتب نے اپنے حُسنِ ظن سے کام لیکر مکتوب الیہ کی حالت کا بہت غلط اندازہ کیا۔

نماز کے ارکان ظاہری پوری طرح ادا ہوجائیں، یہ دولت بھی کچھ کم نہیں، اس کا پُورا اہتمام رکھا جائے اور باطنی یکسوئی کی خاطر اس کی ناقدری ہرگز روا نہ رکھی جائے۔

مقدم یہ ہے کہ کوئی ارادی بے توجہی نہ ہونے پائے۔ باقی غیر ارادی بے توجہی کے لیے امیدِ عفو اللہ سے رکھی جائے۔ باقی بزرگوں سے یہ سننے میں آیا ہے کہ توجہ اگر برابر خانۂ کعبہ کی طرف جمی رہے تو اس سے حضورِ قلب حاصل ہو جائے گا۔ وضو پورے اہتمام سے کرنا، وضو اور نماز کے ہر ہر رکن کو شعوری توجہ سے ادا کرنا، کم سے کم نیت باندھتے وقت حضورِ قلب کا موجود رکھنا ہر ذکر و تسبیح کو ارادہ کرکے اور حتی الامکان مفہوم سمجھ کر ادا کرنا اور بجائے کم سے کم تعداد میں ادا کرنے کے بڑی تعداد میں ادا کرنا۔ اکل حلال اور صدق مقال کا حتی الامکان اہتمام رکھنا۔ اس قسم کی ساری ہی چیزیں حضورِ قلب میں معین ہوسکتی ہیں۔

(۹)

جزئیاتِ دین میں غلوُ

(س) خدا آپ کو سلامتی کی راہ دکھانے کے لیے تادیر مامور رکھے۔ اللہ معاف فرمائے "اسلام کے راستے" کے بجائے "سلامتی کی راہ" کے الفاظ دانستہ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ بالفعل اسلام کا راستہ بتانے والوں میں باہم وہ افتراق اور کشتم کشتا ہے کہ خدا کی پناہ!

(ج) قرآنِ مجید کی فہم و تعبیر میں اختلاف ہونا تو ناگزیر ہے۔ صحابیوں اور بڑے بڑے ممتاز صحابیوں تک کے درمیان اختلاف تھا۔ یہی حال اتباعِ سنّت کا ہے۔ جس نے رسُول کو جس حال میں دیکھا اسی کو سُنّت سمجھ کر اس کی پیروی ضروری خیال کی۔ انھیں دونوں بنیادوں پر مختلف مکتبِ خیال شروع سے پیدا ہو گئے ان کے قائم رہنے میں مطلق مضائقہ نہیں۔ یہ انتظام تو اُمت کی عین سہولت کے لیے تھا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے مذاق و فہم و استعداد کے مطابق ایک سند مل جائے

غضب یہ ہوا کہ ان اختلافات پر جمود و عصبیت کا اضافہ ہو گیا، اور انھیں عین دین سمجھا جانے لگا —— جزئیاتِ عقائد و جزئیاتِ اعمال کے اندر اختلاف

کی بڑی گنجائش ہیں۔ بہ قول حضرت اکبر الہ آبادی ؎

ہر شیخ یہ کہتا ہے عقائد ہیں تو یہ ہیں!

توحید یہ کہتی ہے زوائد ہیں تو یہ ہیں

اقرارِ توحید و رسالت کے بعد واقعی دوسری چیزیں "زوائد" ہی میں داخل ہیں۔ یہ زوائد بھی ناقابلِ اعتناء نہیں۔ بعض زوائد بھی یقیناً بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور پورے اہتمام و توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن بہر حال اصل نہیں ہیں فروع ہیں، جزء نہیں ہیں۔ شاخیں ہیں شاخوں کے کٹ جانے سے درخت میں جتنی بھی بدنمائی پیدا ہو جائے درخت بہر صورت اپنی جگہ قائم رہے گا۔ جب تک کہ جڑ ہی پر صدمہ نہ پہنچ جائے۔

بالکل یہی حال دین کا ہے۔ اصل اور فروع (بہ شمول اہم ترین فروع) کے درمیان فرق مراتب رکھنا لازمی ہے۔

(س) اور آپ جو راستہ دکھاتے ہیں وہ بالکل اسلام کا اپنا سیدھا سادا راستہ معلوم ہوتا ہے جس میں نہ فرقہ بندی کی آلائش ہے نہ مکتبِ خیال کا جھگڑا۔ اللہ جزائے خیر دے۔ اور آپ کی مثال سے دوسروں کو توفیق نیک دے۔

(ج) جزئیاتِ دین کا بھی تحفظ اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اس میں شدت و غلو ہرگز نہ پیدا ہونے پائے بلکہ اعتدال و توازن کے ساتھ شاخ کو اصل کے ماتحت ہی رکھا جائے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ تحزب (فرقہ بندی) بدترین شکلوں کے ساتھ پھوٹ پڑے گی، اور اُمت بے شمار فرقوں میں بٹ جائے گی جس میں ہر فرد کو اپنا مخصوص فرقہ اُمت سے کہیں بڑھ کر اہم و عزیز نظر آنے لگے گا، اور اس کی ساری ہمت بجائے اُمت کے اس فرقہ کا بول بالا رکھنے میں صرف ہو جائے گی۔

اسی کا نام تعصّب ہے۔ ضرورت اس فرقہ واری عصبیت وحمیت کو اسلامی عصبیت وحمیت کے ماتحت اور اس سے مغلوب رکھنے کی ہے۔

(س) ہم عامیوں کو دو باتیں کھٹکتی رہتی ہیں۔ کہیں ذکر چھڑ جائے تو کم علمی کے باعث وقت پر معقول جواب نہیں بن پڑتا۔ ایک مسئلہ تناسخ ہے جو اپنے اندر بہ ظاہر منطقی رعائتیں رکھتا ہے مثلاً کانے، لولے کی پیدائش۔ جس کی توجیہ اپنے عقیدے کے بموجب ذرا دشوار ہے۔

(ج) مسئلہ تناسخ کی حیثیت اسلام میں نیم بنیادی اور نیم فرعی ہے۔ اسلام کے بنیادی مسائل میں توحید و رسالت کے بعد تیسرے نمبر پر مسئلہ جزا و سزا سے عقیدۂ قیامت ہے، جس نے مسئلہ تناسخ (یا روح کے آواگون) کو مانا۔ اس نے عقیدۂ جزا و سزا کو اصلاً تو تسلیم ہی کر لیا۔ البتہ اس کی تعبیر غلط کی —— ایسا شخص اسی حد تک اہلِ حق میں سے ہے کہ وہ ضرورتِ جزا و سزا کا قائل ہے اور اس کی کسی صورت کو اس نے تسلیم کر لیا، اور اس حد تک اہلِ باطل میں سے ہے کہ اس نے اس کی غلط شکل کو قبول کر لیا۔

عام ہندوؤں میں جو عقیدہ رائج ہے اور وہ بدھ مت والوں کے عقیدۂ تناسخ سے بہت مختلف ہے) اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی روح قالب کو چھوڑنے کے بعد کسی دوسرے عالم برزخ میں جا کر مقیم نہیں ہو جاتی بلکہ اپنے اعمال کے مطابق کسی نہ کسی دوسرے جاندار کے قالب میں، اس دنیا میں پھر واپس آ جاتی ہے اور انسانوں کے درمیان میں جو پیدائشی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں (مثلاً کوئی امیر ہے، کوئی مفلس، کوئی تندرست ہے کوئی بیمار۔ وقس علی ھذا) یہ سب نتیجہ ہیں پچھلے جنم کے اعمال کا۔ جس نے

جیسے عمل کیے بس انھیں کے مطابق اس کو پھل ملا۔ یہ مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") کا چکر قدرتی طور پر مشین کی طرح چلتا رہتا ہے اور اس میں دخل کسی حاکم مطلق کی مرضی و ارادہ کو نہیں۔

اس پر کھلا ہوا اور پہلا اعتراض تو یہی ہوتا ہے کہ یہ مشینی نظام حق تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت مطلقہ کے منافی آکر پڑتا ہے۔ قرآن مجید میں فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ قسم کی جتنی بھی آیتیں ہیں (اور وہ بکثرت ہیں) سب اسی صفت حاکیت اعلیٰ کے اثبات کے لیے ہیں۔ ارادۂ الٰہی ہر مشینی نظام پر غالب و حاکم ہے۔ حق تعالیٰ جس کسی کی چاہے محض اپنے ارادہ سے بخشش کر دے اور یہ عقیدۂ "کرم" اس میں آکر حائل ہوتا ہے ——— اور اکیلے اس صفت حاکمیت مطلقہ میں نہیں بلکہ اس کی صفات رحیمیت اور رحمانیت میں بھی ——— وہ ارحم الراحمین جس کسی کے بھی بڑے سے بڑے قصور چاہے معاف کر دے۔ وہ سزا دینے پر مجبور کسی جہت سے بھی نہیں۔ حالانکہ اس عقیدۂ "کرم" کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خطاکار انسان کی روح لازمی طور پر اعلیٰ سے ادنیٰ قالب کی طرف آئے۔ غرض اس کو مان لینے سے جس خدا کا تصور پیدا ہوتا ہے وہ محض ایک ناقص و محدود القویٰ خدا ہے۔

پھر اس عقیدہ کو فرض کر کے یہ سوچئے کہ جب انسان کی آفرینش شروع میں ہوئی ہوگی۔ جب آخر عملی صورت دنیا میں انسانوں کی پیدائش کی کیا ہوئی ہوگی؟ کیا اس وقت سارے انسان بالکل برابر پیدا ہوئے تھے؟ ان میں کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا، نہ کوئی امیر نہ مفلس، نہ کوئی حاکم نہ محکوم۔ نہ کوئی بد صورت نہ بیمار، نہ کوئی دلیر نہ بزدل وغیرہا؟ اس مساوات کاملہ کا کوئی بھی

امکان عقل میں آتا ہے؟ بالفرض۔ تو کوئی نظم معاشرت و معیشت چند لمحوں کے لیے بھی کیونکر چل سکا؟ ــــــ اور اگر مساوات کاملہ نہ تھی، بلکہ اختلافات تھے تو وہ آخر کس بنا پر؟ کوئی نسل تو اس سے قبل تھی ہی نہیں جس میں اعمال کا سوال پیدا ہو سکا ہو۔ پھر اگر اختلافات اس وقت نبھ گئے تو اب بھی بغیر اس خاص توجیہ کے نبھ سکتے ہیں۔

اسلامی عقیدہ میں روح کو دوبارہ اس دنیا میں آنا نہیں ہے۔ قالب چھوڑنے کے بعد ہی اس کا عالم آخرت شروع ہو جاتا ہے۔ اجمالی حساب کتاب قبر یا برزخ ہی میں ہو جاتا ہے اور تفصیلی یوم حشر کو ہوگا۔ یہی بالکل لگتی ہوئی اور قرین قیاس چیز ہے۔ یہودیت، مسیحیت غرض کل سامی مذاہب نے یہی مانا ہے۔ ہندوستان میں روح کو غیر مخلوق ازلی اور ابدی سمجھا گیا ہے۔ اسی کی جھلک عقیدۂ تناسخ میں بھی نظر آتی ہے۔ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں تردید اسی عقیدے کی ہے۔ یعنی روح گو ابدی ہو لیکن بہرحال ازلی و غیر مخلوق نہیں۔ اللہ ہی کے "امر" سے ہے۔

پھر دنیا کی آبادی میں انسانوں کی تعداد برابر بڑھتے رہنے کا قرینہ بھی عقیدۂ تناسخ کے خلاف ہی جاتا ہے۔ جب روح کی اسی تعداد کو بار بار آنا ہے تو یہ نئے قالبوں کے لیے روحیں کہاں سے آجاتی ہیں؟ تا وقتیکہ یہ نہ ثابت ہو جائے کہ جانوروں کی تعداد برابر گھٹتی جاتی ہے اور انھیں کی روحیں ترقی کر کے انسانی قالب میں آتی جاتی ہیں۔

(س) ثانیاً مسئلہ کنیز ٹھیٹھ اسلامی طریق میں یہ اب بھی جائز ہے یا نہیں۔ اور کس حد تک؟

(ج) مسئلہ غلامی و کنیزی کا اصل تعلق جہاد سے ہے اور اب جب خالص اسلامی حکومت ہی دُنیا سے تقریباً ناپید ہے اور نہ کہیں جہاد باقی ہے اور نہ حدود اور شرعی تعزیرات کا نفاذ (بجز چند بہت محدود رقبوں کے) تو قدرتاً شرعی غلاموں اور کنیزوں کا وجود بھی عنقا ہی ہے ——— جنگی قیدیوں کا مسئلہ فاتحین کے لیے آج تک ایک دردِ سر بنا ہوا ہے، اور جتنے بھی حل اب تک تجویز ہوئے ہیں، کوئی بھی ان میں سے سو فی صدی پسندیدہ نہیں۔ اسلام نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ قیدیوں میں سے جو مرد ہوں، انھیں فاتحین آپس میں تقسیم کر کے اپنے خاندان کا گویا جزو بنا لیں۔ ان سے کام کرائیں، محنت لیں۔ لیکن ان کی عزت، صحت اور آسائش کا پورا خیال رکھیں اور اسی کا نام شرعی اصطلاح میں غلامی ہے، اور جہاں تک ممکن ہو انھیں آزاد ہی کرتے رہیں۔

عورتیں اور لڑکیاں جو دُشمن کے مغلوب ہو جانے پر قید ہو کر آئیں انھیں بھی اپنے گھروں میں اسی طرح رکھیں اور ان کے ادائے حقوق کے باب میں اللہ سے ڈرتے رہیں۔ ان کا علانیہ گھر میں جگہ دینا خود ایک اعلانِ نکاح کا قائم مقام ہے اور ان سے تزویج کے لیے کسی الگ ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے غلاموں کی طرح باندیوں کے لیے بھی تحقیری الفاظ کو ناپسند کیا ہے اور بجائے ان کے "جاریہ" اور "فتاۃ" کو رواج دیا ہے۔

(۱۰)

رسمِ غلامی

(س) ۹ر اگست کے صدق میں آپ نے تین قرآنی سوال کے زیر عنوان جو جوابات ارشاد فرمائے ہیں وہ آپ کی قرآنی بصیرت اور وسعتِ نظر پر دلیل ہیں۔

(ج) یہ محض اللہ کا کرم ہے جو دلوں میں یہ مقبولیت پیدا کر دیتا ہے ورنہ اپنی بصیرت اور اپنی نظر دونوں کا حال اپنے ہی کو خوب معلوم ہے۔

(س) البتہ یہ بہ ادب گزارش ہے کہ تیسرے سوال کا جواب پوری طرح تشفی بخش نہ نکلا۔ دین کی تعلیمات سے یا فلاسفروں کے اقوال سے مقابلہ کر کے یہ کہنا کہ ان کے ہاں بھی غلامی جائز ہے کوئی مضبوط دلیل نہ ہوئی۔

(ج) بلاشک۔ لیکن سوال رسمِ غلامی کے یکسر ناجائز پر نہ تھا۔ سوال سے صرف اتنا متبادر ہوتا تھا کہ سائل اسے عرفِ عام یا مسلمات بشری کے خلاف سمجھ رہا ہے۔ اور اسی بنا پر اس کے ذہن کو حیرانی ہے ــــــ سوال کا جواب صرف اسی مفروضہ کی بنیاد پر تھا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ تاریخِ عالم میں نہ تو کسی دین نے اسے یکسر ناجائز ٹھہرایا ہے اور نہ غلط

قرار دیا ہے کسی عقلی بنا پر اور یہ جواب اپنے محدود دائرہ کے اندر اب بھی قائم ہے۔ جب تک حرمتِ غلامی کی کوئی مستقل دلیل پیش نہ ہو۔

(س) اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ کا پرچار کرنے والی کتاب ہدایت میں اس حریتِ انسانی کی حرمت کا واضح اظہار نہ ہونا اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکا۔

(ج) تو گویا حرمتِ غلامی پر مستقل دلیل یہ قائم ہوئی ہے کہ یہ نصِ صریح وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا الخ کے منافی ہے۔ لیکن اسی میں تو کلام ہے۔ یہ نص جوازِ غلامی کے خلاف ہی کہاں ہے۔ آیت کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ——— نہ تو انسان پیدائشی طور پر ایک حقیر و ذلیل مخلوق ہے جیسا کہ بعض بڑے مذہبوں نے فرض کر رکھا ہے۔ اور نہ بنی آدم کی فلاں فلاں نسلیں اور شاخیں، جیسا کہ بعض مذہبوں نے مان رکھا ہے بلکہ نوع انسانی معزز و مکرم عند اللہ ہے۔ اللہ نے اسے بہترین تقویم سے پیدا کیا اور اسے اپنی خلافت کا اہل گردانا۔ اس سے مقصد رد صرف ان باطل نظریوں کا ہے۔ اس کو اس مسئلہ سے مطلق تعلق نہیں کہ نظام تکوینی میں جو تفاوت مراتب انسان انسان میں قائم ہے کہ کوئی شاہ ہے کوئی گدا ہے، کوئی سلطان ہے کوئی رعایا، کوئی مخدوم ہے کوئی خادم۔ کوئی آقا ہے کوئی غلام۔ اور رسم غلامی پر اس سے کوئی زد نہیں پڑتی ——— اگر کسی کے نزدیک غلامی فی نفسہٖ حرام ہے تو اسے اس پر کوئی دلیلِ نقلی کتابُ اللہ سے پیش کرنا ہے اور یا پھر دلیلِ عقلی فطرتِ بشری سے لانا ہے۔

(س) شاید عملی مشکلات کے پیشِ نظر ایسا ہوا ہے۔

(ج) شریعتِ الٰہی عملی مشکلات کا ایک حد تک لحاظ کرتی ہے لیکن ایسا نہیں کہ ماحول کی رعایت سے حرام کو حلال کر دیا جائے۔ غلامی سے جو عملی خرابیاں پیش آ رہی تھیں۔ ان کا پورا پورا مداوا احادیثِ نبویؐ میں موجود ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) اپنا برتاؤ غلاموں کے ساتھ بہترین رکھو۔ انھیں اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ ان پر سخت گیری نہ کرو، ان پر زیادہ مشقت نہ ڈالو۔ ان سے برتاؤ ذلت وحقارت کا نہ کرو بلکہ وہ برتاؤ کرو جو بھائی بندوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے

(۲) ان کو آزادی دیتے رہنا ایک بڑا کارِ ثواب ہے۔ فلاں اور فلاں گناہوں کا کفارہ اُن کی آزادی سے ممکن ہے۔

(س) ایک سوال یہ دماغ میں گشت کر رہا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہوئی کہ عربی مدارس میں بجائے قرآن مجید یا اس کی تفسیر و تعلیمات کے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر منقولات یعنی پرانے فلسفہ اور ہیئت کا اتنا زور ہو گیا۔ درسِ نظامی میں ان چیزوں کو آخر اس درجہ کیوں اہمیت دے دی گئی۔

(ج) درسِ نظامی تو خیر بہت بعد کی چیز ہے۔ کوئی ڈھائی سو سال سے جاری ہوا ہے جب امت انحطاطِ دینی کے بہت سے درجے طے کر چکی تھی۔ عام بدبختی اور بداخلاقی تو اُمت میں خلافتِ راشدہ کے معاً بعد ہی پیدا ہو گئی تھی۔ یعنی آخرت اور حقائقِ دین کی طرف سے غفلت اور بے رغبتی اور دُنیا طلبی کا غلبہ۔ اور اس کے اثر سے جس طرح زندگی اور تمدن کا کوئی گوشہ نہ بچا۔ وہی حال تعلیم و تربیت اور درس گاہوں کے نظام کا ہوا اور

خلافت راشدہ میں خلیفہ تو اُمّت کے انتخاب سے ہوتا تھا (انتخاب خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ ایجابی صورت میں، سلبی صورت میں بہرحال انتخاب ہی ہوتا تھا) ولی عہدی کی نامزدگی، اور وہ بھی خلیفہ کے بیٹے کی، تمام تر شاہانِ بنی اُمیّہ کے زمانہ میں پڑ گئی تھی اور یہ خود نتیجہ تھا اسی ایمان کی کمزوری کا اور تقلید تھی۔ شعوری یا غیر شعوری۔ گرد و پیش کے ملوک و سلاطین کی۔ روم، فارس، ہند۔ ہر کہیں طریقہ تخت و تاج کے توارث کا جاری تھا۔ یہی مسلمانوں نے بے تکلف لے لیا۔ اور نام کے خلیفہ حقیقتاً دُنیاوی بادشاہ اور جہاں پناہ بنتے چلے گئے۔ بنو اُمیّہ کے بعد عبّاسیہ نے عجمی تخیلات و تکلفات کو اور زیادہ ترقی دی اور غیروں سے مرعوبیت دل و دماغ پر نمایاں طور پر چھا گئی اور فکر اسلامی، فکر جاہلی میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

نظامِ تعلیم عام نظامِ معاشرت و تمدن سے الگ اور غیر متاثر کیسے رہتا۔ خشیتِ الٰہی گھٹتی گئی اور سلطنت، ملک گیری حکمرانی کے خیالات نے غلبہ پالیا اور کیا عرب، کیا عجم، کیا ہند، کیا مصر، کیا اسپین، سب ہی کہیں یہ دبا عام ہو گئی۔ اورنگ زیب ہندوستان میں اپنی دینداری کے لیے مشہور ہے۔ وہ تک وقت کے غیر اسلامی تقاضوں کو نہ روک سکا اور حصولِ سلطنت کے لئے باپ اور بھائیوں سے لڑ بیٹھا۔

اب اگر مزید سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ دنیا طلبی ہی کیوں غالب آئی اور خشیتِ الٰہی کیوں سمٹتی اور سکڑتی چلی گئی، تو اب مشیتِ الٰہی کے رازوں تک رسائی کس کی ہو سکتی ہے؟

ما بر دریم دشمن و مامی کشیم دوست
کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما

(س) ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے شعبۂ دینیات میں اتنی اہمیت فقہ اور مسائل عبادت وطہارت کو کیوں دی گئی اور یہ جگہ اسلام کے عام اصُول کو کیوں نہ حاصل ہوئی؟

(ج) کیا علی گڑھ دُنیائے اسلام اور اسلامی ہند سے کچھ الگ تھا۔؟ جس ابتلاء میں سب مبتلا ہوئے اس میں وہ بھی پھنس گیا۔ بلکہ سیّد احمد خاں مرحوم تو اپنے عقائد وخیالات کے لحاظ سے یوں ہی بدنام تھے۔ علی گڑھ کو تو اور زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ پھر علی گڑھ میں اس شعبہ کے جو سربراہ شروع سے رہے (مثلاً مولوی عبداللہ انصاری نانوتوی دیوبندی) وہ اپنے درجۂ تقدس، دینداری اور عبادت گزاری کے لحاظ سے جیسے بھی بلند ہوں، اپنے خیالات میں بڑے ہی متقشف تھے۔ یہ تنگ نظری تو اب جاکر کچھ کم ہوئی ہے اور ندویت اپنا اثر دیوبند تک میں دکھانے لگی ہے۔

(۱۱)

خُدا اور رسولؐ کی رحمت

(س) بہت دنوں سے میرے خیال میں یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے کہ رسول اللہؐ تو پوری دُنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے، تو پھر کفار کے خلاف تلوار کیوں اُٹھائی۔ بہت سے لوگوں سے پوچھا، مگر کوئی مطمئن نہ کر سکا۔

(ج) تعجب ہے کہ اس سے پہلے اور بہت پہلے آپ کے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ آیا کہ اللہ میاں تو رحمٰن و رحیم ہیں بلکہ اپنے کو ارحم الراحمین کہلاتے ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ دنیا میں ہر طرف کشت و خون، لوٹ مار، ظلم و تعدی جاری ہے! درندوں اور جنگلی، وحشی جانوروں کو چھوڑیے خود عالمِ انسانیت میں کس قیامت کی سفاکی و شقاوت آج سے نہیں اول روز سے برپا ہے۔ کتنے خونِ ناحق ہر روز ہوتے ہیں کتنے مظلوم ہر وقت چیختے چلاتے رہتے ہیں۔ کتنی سہاگنیں ہر روز بیوہ اور کتنے بچے ہر وقت یتیم ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب آخر کیا ہے اور اس عالمی خلفشار و رستخیز کو رحمت کامل سے کیونکر تطبیق دی جائے۔ ہے یہ کہ ہم مشاہدہ انسانی کی کمی اور انتہائی محدودیت کے باعث رحمتِ کامل کا مفہوم سرے سے

غلط سمجھتے ہیں۔ اگر مشاہدہ کامل ہوتا اور نگاہ اس درجہ محدود نہ ہوتی تو اِس لامحدود و مسلسل کائنات کے ایک ایک جزیہ کو نظر کے سامنے لے آتے اور ہر کڑی کا ربط واضح طور پر دوسری کڑی سے دیکھ لیتے اور اس وقت کوئی چیز بھی ناگوار اور خلاف رحم دکھائی نہ دیتی۔

رسُول کی رحمت بھی خدا کی رحمت سے الگ نہیں۔ رحمۃ للعالمین کے معنی ہی صرف یہ ہیں کہ ہر موقع رحم پر آپ کا برتاؤ رحم ہی کا رہا، اور ہر دو عالم کے لیے آپ کا وجود باعثِ برکت و موجب رحمت اور وجہ فضل رہا اور سارے عالم کو فلاح بہبود و ہدایت کا راستہ آپؐ ہی کی ذات سے ملا ــــ یہ مُراد نہیں کہ آپؐ نے موقع بے موقع کا کوئی لحاظ ہی نہ رکھا اور اندھا دھند شیر اور بکری، سانپ اور چیونٹی اور سنکھیا اور شہد کے ساتھ ایک ہی معاملہ رکھا۔

ڈاکٹر نشتر بھی لگائے گا، ہاتھ پیر بھی کاٹے گا۔ طبیب مسہل بھی دیگا فاقہ بھی کرائے گا، کڑوی سے کڑوی دوا بھی پلائے گا۔ باپ لڑکے کی تادیب کے لیے سزا بھی دے گا، اور یہ سب کچھ محبت، شفقت اور رحم ہی کے تحت ہوگا۔ ظلم و بے رحمی کا اطلاق ان میں سے کسی ایک موقع پر بھی نہ ہوگا۔

عام حالات اور ذاتی معاملات میں آپؐ کا برتاؤ انسان تو انسان جانوروں تک کے ساتھ شفقت و مہربانی کا رہا۔ آپؐ کی ہمدردی، نرم مزاجی

چشم پوشی، کریم النفسی دشمنوں تک کو مسلم تھی۔ لیکن جب موقع سختی کا آپڑا اور بجز بگڑے آپریشن کے کوئی صورت مریض کے اور سارے عالم کی فلاح و بہبود کے لیے نہ رہ گئی تو حکم الٰہی سے آپؐ نے جہاد و قتال بھی کیا، تاکہ دنیا کی راہ سے فساد دور ہو اور امن کی راہ کل عالم کے لیے کھل جائے

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ

(س) رسول اللہؐ کو لوگ مارتے تھے، اور آپؐ اُن کے لیے دعائے خیر کرتے تھے۔

(ج) عام طبیعت آپؐ کی بے شک یہی تھی۔ اپنی ذات کے لیے آپ بڑی سے بڑی حد تک عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ لیکن ضرورت کے وقت آپؐ آپریشن کرنے اور خون بہانے کے فن سے بھی عاجز یا اس میں اناڑی نہیں تھے۔

(س) میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپؐ نے کفار کے خلاف تلوار کیوں اٹھائی۔؟

(ج) ان شاء اللہ اب سمجھ میں آگیا ہوگا ۔

لطف و قہر او سراپا رحمتے
آں بہ خویشاں ایں بہ اعداء رحمتے

(س) جماعتِ اسلامی کے زیر اثر اسلامی ادب کے کام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

(ج) بہت ہی اچھا خیال ہے۔ جماعتِ اسلامی ہند کے کاموں میں یہی تو

ایسا ہے جس سے سو فی صدی اتفاق ہے ___ اس خدمت سے بڑھ کر تو اور کوئی بھی دینی خدمت اس وقت نہیں کہ دُنیا کے علوم و فنون کو مسلمان اور باخدا کیا جائے۔

عصر حاضر کے سارے فتنوں کا سرچشمہ تو یہی دنیا کے علم و فن کی خدا بیگانگی اور مذہب ناآشنائی ہے، اور جس نے یہ کرلیا، کہ جغرافیہ کو مسلمان کرلیا تاریخ کو مسلمان کرلیا، ادب کو مسلمان کرلیا، سائنس کو مسلمان کرلیا، ریاضی کو مسلمان کرلیا، طب کو مسلمان کرلیا اس نے ساری دنیا سے اسلام کا کلمہ پڑھوالیا ___ گو ظاہر ہے کہ کام ہے اتنا عظیم الشان کہ ایک فرد کا کیا ذکر ہے، سو دو سو بھی بڑے بڑے عالم و فاضل مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے ہیں۔ دنیا کی ہزار ہا یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں سے بیک وقت لڑنا ہوگا۔ کم سے کم یورپ کی ۴، ۵ مشہور ترین زبانوں میں۔

(س) اور اس کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟

(ج) اس سوال کو چھوڑیئے۔ ہمارے آپ کے بس کا نہیں۔ اگر گنتی کے کسی ایک اسکول، ایک کالج کو آپ نے نامسلمان ہوتے سے بچالیا تو حشر کی عدالت میں یہی آپ کو سُرخ رو بنانے کے لیے بالکل کافی ہوگا۔ انشاء اللہ

من طریقِ سعی می آرم بجا
لیسَ لِلْاِنسانَ اِلّا ما سعیٰ

(س) آپ یا اور کوئی صاحب گاندھی جی کا شمار موحدوں میں کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ان کا یہ قول موجود ہے کہ:- "I am Proud of being

"a Hindu" - (مجھے اپنے ہندو ہونے پر فخر ہے).

(ج) اشتباہ لفظ "اے ہندو" سے پیدا ہوا ہے جس کو سائل نے "مشرک" کے مرادف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہی تو اصل سوال ہے۔ گاندھی جی بیشک اپنے کو ہندو کہتے تھے لیکن خود ہندو کی تشریح ایسی کرتے تھے جس سے شرک کا اثبات نہیں بلکہ اس کی نفی ہو جاتی تھی۔ کہتے ہیں اپنے لیے

"I Perfectly belive in unity of God"

"میں خدا کی توحید پر کامل ایمان رکھتا ہوں"۔

اور اکیلے گاندھی جی ہی نہیں، ماضی قریب کے متعدد ہندوؤں نے اپنے کو موحد ہی کہا ہے۔ مثلاً آربندو گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ اور عجب نہیں کہ زندہ اصحاب میں پنڈت سندرلال بھی اپنا مذہب کچھ ایسا ہی بتاتے ہوں، اور خود برہمو سماج نے جس کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے، اپنی بنیاد ہی رد شرک و اثبات و توحید پر رکھی ہے کیشپ چندر سین اس کے ایک بڑے علمبردار ہوئے ہیں اور رابندرناتھ ٹیگور تو ابھی بہتوں کو یاد ہوں گے۔

(۱۲)

دُعا اور تکوینی مصلحتیں

(س) پچھلی جولائی سے اسی مقام پر تعینات ہوں، گو باقاعدہ تبادلہ ابھی تک نہیں ہوا ہے صرف ڈیپوٹیشن پر آیا ہوں۔ اس مہینہ میں سٹی الاؤنس اور "ہاؤس رنٹ" جن کی میزان...... کی ہوتی ہے کٹ جائیں گے۔ محکمہ کا قانون یہ ہے کہ چار مہینے کے بعد یہ دونوں رقمیں نہیں لی جاتی ہیں۔ نہ معلوم مالک کی کیا مصلحت ہے...... اہلیہ مع بچّوں کے ..... میں ہیں، وہیں ولادت ہونے والی ہے۔ کوشش کر ہی کیا سکتا ہوں۔ بہر حال تکلیف میں ہوں اور صبر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ دعا ضرور فرمائیں۔ اللہ پاک مصیبتوں سے نجات دے۔

(ج) دُعا تو ہر کلمہ گو کا حق ہے۔ اور ان شاء اللہ ٹوٹی پھوٹی کر ہی دی جائے گی۔ تدبیر و کوشش میں بھی جائز حقوق کے اندر مضائقہ نہیں۔ اللہ مشکلات کو دُور کرے اور ہر طرح کی سہولت اور سکونِ قلب نصیب کرے۔ رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ اور اَللّٰهُمَّ حَصِّلْ مُرَادَنَا وَیَسِّرْ اُمُوْرَنَا کا ورد رہے تو بہتر ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی دل میں پوری طرح اتار لینے والی اور ہر وقت مستحضر

رکھنے کی ہے کہ اس عالم ناسوت میں فرمانروائی کسی بندے کی نہیں بلکہ ایک حکیم کُلّ و علیم کل کی ہے۔ تکوینی مصلحتیں بے شمار ہیں اور ان کو نظر میں صرف حکمت کامل اور علم کل ہی رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے۔ حالات کے اُتار چڑھاؤ سے خوشی و ناخوشی سے کسی بندہ کو کسی حال میں مفر نہیں۔ اولیائے کاملین ہی نہیں انبیاء مقربین تک کو قدم قدم پر طرح طرح کی ناگواریوں سے سابقہ برابر رہتا ہے اور ساری عمر امتحان ہی کی نذر ہو جاتی ہے۔ بس ایک کے درجے دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔۔۔ سارا اجر و ثواب انھیں خلافِ مزاج و طبیعت حالات پر صبر و ثابت قدمی کا ہے۔

یہ ماہ مبارک تو خصوصی طور پر موزوں کثرت استغفار و تلافی مافات کے لیے ہے جس حد تک بھی اپنے سے بن پڑے، اس میں غفلت کو ذرا بھی راہ نہ دیں، اور دعاؤں پر جتنی زیادہ توجہ دی جا سکے تسکینِ قلب اسی قدر حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ

ایک اونچے تعلیم یافتہ علیگ کا خط۔ "عرصہ ہوا کہ فلاں بزرگ سے بیعت ہو گیا ہوں بلکہ ان بزرگ نے ازراہِ نوازش و کرم خود ہی سبقت فرما کر اپنی بیعت میں لے لیا۔"

جواب گیا تھا کہ "خبر سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ان بزرگ کی بزرگی و مقبولیت میں تو شبہ نہیں۔ گفتگو اس میں ہے کہ بیعت کا جو طریقہ رائج ہے وہ ہر تعلیم یافتہ کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ اگلے زمانہ میں تو مرشدین ہی دنیا و معاملات دنیا سے بے تعلق سے رہتے تھے۔ گوشہ نشین اب مرشد و مرید دونوں ایک ایک مسئلہ میں دخیل رہتے ہیں۔ مرشد مسلم لیگی ہے تو مرید کانگریسی۔ اور پھر علمی مسائل میں

اختلاف قدم قدم پر رکھا ہوا، پھر اطاعت و دلجمعی جو ارادت کی شرطِ اولین ہے کیسے قائم رہ سکتی ہے اور دونوں کی رائے خیال و مسلک میں توافق کہاں تک رہ سکتا ہے محض عقیدت کی حد تک مضائقہ نہیں۔ لیکن باضابطہ بیعت کا معاملہ دوسرا ہے"۔

اس کے بعد :

(س) گرامی نامہ پہنچا، بہت فائدہ ہوا۔ بہت سی اصولی اور بنیادی باتیں اسمیں ل گئیں۔

(ج) الحمدللہ!

(س) اپنی ناقص فہم میں بھی عرصہ سے یہ بات آرہی تھی کہ اصلاحِ نفس کا پرانا طریقہ خاص طور پر اس دور کے انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھوں کے لیے بالعموم زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا۔

(ج) بے شک! اور اس کا ایک بڑا سبب ہے زمانے کی ہوا۔ یعنی ماحول کا تمامتر بدل جانا ہے، جس نے ہر دماغ میں دو نئے مسئلے کھڑے کردیئے ہیں جن سے قدیم زمانے کے شیخ و مرید دونوں ناآشنا تھے۔

(س) خود شیخ کا جو تصور چلا آرہا ہے اس میں شاید ترمیم کی ضرورت بیجا نہ سمجھی جائے۔ مراد اس سے اپنی یہ ہے کہ جہاں تک اتباعِ سنت میں رسوخ حاصل کرنے کا سوال ہے، شیخ کی صحبت اور اس کے ارشادات سے استفادہ بہت ضروری ہے اس لیے کہ علم کی بنا پر کسی بات کا کہنا یا بیان کرنا ایک بات ہے اور قلب کی گہرائیوں میں اسے محسوس کرنے کے بعد زبان سے ادا کرنا بالکل ایک دوسری بات۔ شیخ کے ارشادات کی یہ کیفیت میرے خیال میں شاید یہی ہوتی ہے۔

ج ماشاءاللہ! یہ فہم صحیح مبارک ہو۔

س لیکن اس کے باوجود بھی مسائل کی تحقیق میں اختلاف کی گنجائش رکھی جائے۔

ج اور افسوس ہے کہ موجودہ پیری مریدی میں یہ نہیں ہوتا۔

س بشرطیکہ مرید کی علمی استعداد قابل اعتبار ہو۔

ج بے شک۔ لیکن یہ بھی خود مرید ہی کے سمجھنے کی بات ہے۔

س کامل اتفاق پر خود شیخ کو بھی اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔

ج اور اس اتفاق و اتحاد کا دائرہ اب صرف دینی، علمی، فقہی، اعتقادی مسائل تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ روزمرہ کی زندگی کے بے شمار جزئیات اس کے اندر آ گئے ہیں۔ موجودہ اخبارنویسی، اخباربینی اور اخبار بازی کے دور سے قبل ان ان گنت مسائل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

س یہ تو مسائل کی تحقیق کی بات ہوئی۔ جہاں تک شخصیت و سیرت کا سوال ہے وہاں بھی تقدس و بزرگی کے باوجود بھی انسان بشریت سے خارج نہیں ہو جاتا۔

ج بے شک۔ انسان۔ یعنی شیخ۔

س بس اس کا کمال یہ ہے کہ اپنی ملکوتیت کو بشریت پر غالب رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہو۔

ج درست ہے۔

س اسی لیے مرید کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بہ اقتضاء بشریت شیخ سے بھی لغزش ہو سکتی ہے۔

(ج) یہ بھی درست ہے۔

(س) ہاں یہ ضرور ہے کہ خدا اور رسولؐ سے نسبتِ تامہ کی برکت سے اپنی غلطی پر جلد متنبہ ہوجاتا ہے اور توبہ و رجوع کے ذریعہ اپنی مقبولیت اور بزرگی میں اور اضافہ کرتا ہے۔

(ج) کم سے کم حسنِ ظن تو یہی رکھنا چاہیئے۔

(س) شیخ کے متعلق جو باتیں اپنے ذہن میں تھیں، بے تکلفی بلکہ شاید بیباکی کے ساتھ عرض کردیں۔ مقصود اس سے خود اپنی اصلاح ہے۔ جو باتیں اسمیں لائق اصلاح و قابلِ ترمیم ہوں ان میں اصلاح و ترمیم کردی جائے۔

(ج) ماشاء اللہ! اس فہم سلیم پر دوبارہ مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔

(س) اللہ تعالیٰ لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

(ج) آمین!

(۱۳)

لاٹری کی آمدنی

(س) بہت دنوں سے آنجناب کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے کا ارادہ کر رہا تھا، اطمینان و سکون کے چند لمحے بھی نہیں مل رہے تھے۔

(ج) یہی حال دنیا کی مصروفیتوں میں ہر شخص کا نوشتۂ تقدیر ہے، کیسے کیسے خوش گوار اور ناخوش گوار لیکن بہر حال ہمہ وقتی تجربوں کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی معنی ہیں عالم ابتلاء کے۔

(س) ننھیال میں بچی کے داہنے بازو کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا (آگے علاج اور پیچیدگی کی تفصیل درج ہے)

(ج) بہت ہی دل دکھا۔ اللہ شفائے کامل دے ـــــ شادی کے بعد اور پھر سلسلۂ اولاد شروع ہو جانے کے بعد لامتناہی آزمائشیں اسی قسم کی ہونے لگتی ہیں۔ تزکیۂ نفس اور تجلیۂ روح کا راستہ انہی منزلوں سے گزرتا ہے۔

(س) اب میڈیکل کالج کا علاج چل رہا ہے۔

(ج) اللہ اپنا فضل فرمائے۔

(س) ایک صاحب سوال کر رہے تھے کہ لاٹری کے ٹکٹ خریدنا ہمارے علماء کیوں حرام بتاتے ہیں جبکہ اس میں کوئی سودی کاروبار نہیں ہوتا اور ایک روپیہ یا چند روپے خرچ کر دینے سے ایک دولتِ کثیر مل جانے کا موقع مل سکتا ہے۔

(ج) شریعت نے ذرائع آمدنی میں صرف سود ہی کو حرام نہیں قرار دیا ہے بلکہ قمار کا بھی درجہ رکھا ہے اور لاٹری کی آمدنی صریحاً حرام ہو یا نہ ہو، بہر حال ہے تو قمار ہی کی ایک شکل مہذب و شائستہ۔ اس لیے مسلمان کو بچنا تو اس سے بھی بہر حال چاہیے۔ Game of Chance. یعنی بغیر کسی مشقت و تعب کے کسی کا محض بخت و اتفاق سے دفعتہً ایک بڑی رقم کا مالک ہو جانا شریعت اسلامی میں پسندیدہ نہیں، سخت ناپسندیدہ ہے اور لاٹری اس حکم میں اچھی طرح آجاتی ہے۔

(س) سورۂ المائدہ کے ختم سے دو آیتیں قبل ایک آیت کا مضمون یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت میں استفسارِ ربانی کے جواب میں عرض کریں گے کہ اگر آپ میحیوں (یا مسیح پرستوں) کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں (آپ ہر طرح مالک و مختار ہیں) اور اگر آپ انھیں بخش دیں تو آپ ہر طرح غالب (ہر چیز پر قادر) اور حکمت والے ہیں۔ (آپ کا ہر عمل حکیمانہ و مناسب حال ہی ہوتا ہے) لیکن اس سے پہلے اسی آیت میں مسیحیوں پر مسیح پرستی، مریم پرستی یعنی شرک کا جرم عائد ہو چکا ہے تو مشرکوں کی مغفرت کیسے ہو جائے گی۔؟

(ج) جس شرک پر ناقابلِ مغفرت ہونے کی وعید آئی ہے وہ بُت پرستوں کا کھلا ہوا اور جلی شرک ہے۔ باقی مسیحی اور دوسرے اہلِ کتاب اس معنی میں مشرک نہیں، وہ اصولاً توحید کے قائل ہیں، نبوت کے قائل ہیں، سلسلۂ وحی کے قائل ہیں، آسمانی کتاب کے قائل ہیں۔ البتہ غلو کر کے اپنے انبیاء، ہادیوں اور اکابر کو درجہ الوہیت پر پہنچا دیا ہے۔ اور اس طرح مخالفت توحید کے ساتھ ساتھ شرک خفی کے بھی مرتکب ہو گئے۔ یہ لازمی نہیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہو جو مشرکوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ پیمبر (حضرت عیسیٰؑ) اس ابہام سے فائدہ اٹھا کر اپنے جواب میں گنجائش مغفرت کی رکھ لیتے ہیں۔

(س) اسی طرح سورۃ الانعام میں ایک آیت ہے ولا تطرد .... من شيئ (اور آپ ان لوگوں کو مت نکالیے جو اپنے پروردگار کی عبادت صبح و شام کرتے رہتے ہیں خاص اس کی رضا کا قصد رکھتے ہوئے۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں الخ) تو جب یہ مومن ہیں اور عبادت پروردگار میں مشغول رہتے ہیں تو ان کے نکالنے کا سوال ہی کیوں پیدا ہوا؟

(ج) انھیں نکالنے کی فرمائش تو مشرکین و منکرینِ عرب کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ یہ امراء و رؤسائے قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کرتے تھے کہ حقیر و کم حیثیت، حقیر اور نیچ لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹائیے تب تو ہم معززین و شرفاء، اکابر و مشاہیر آکر آپ کی بغل میں بیٹھیں۔ ان کی دینی و روحانی بلندیاں ان مشرکوں پر کہاں واضح تھیں؟ —— قرآن مجید نے اسی کو تو واضح کیا اور

آپؐ کو بتایا کہ حقیر و کم حیثیت کیسے ؟ یہی تو اللہ کے سچے پرستار اور دین کے اصل خدمت گزار ہیں۔ آپ انھیں کس طرح نکال سکتے ہیں۔ آپ اس طمع میں بھی ہرگز نہ آئیے کہ شاید ان کے نکال دینے سے بڑے بڑے سردارانِ قوم آنے لگیں، اور اسی طرح دین کی تبلیغ واشاعت آسان ہو جائے۔

(۱۴)

موت و ما بعد الموت کا تصور

(س) مخدومی دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(ج) وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(س) دریاباد سے واپسی پر معاً بعد عزیزی ...... سلمہ کی پاکستانیت کا قصہ سامنے لایا گیا۔ اسی کی دوادوش میں عریضہ میں تاخیر ہوئی۔

(ج) تفصیل سے خبر تو اب بھی نہ ہوئی۔ بہرحال کوئی بات خلافِ ضابطہ نہ ہونی چاہیئے تھی۔

(س) خادم اب مستقل گھر ہی پر ہے۔

(ج) الحمدللہ!

(س) اور عزیزِ مذکور نے خانگی افکار و مشاغل سے سبکدوش کر رکھا ہے۔

(ج) الحمدللہ!

(س) ساری عمر جس طرح ضائع ہوئی، جی چاہتا ہے کہ یہ آخری لمحے اللہ کی یاد میں لگ جاتے۔

(ج) اور آخری لمحہ کا امکان جس طرح آئندہ کے لیے ہر لمحہ ہے، ماضی کے لیے بھی تھا۔

(س) کسی طرح آخرت بن جائے۔

(ج) بے شک ہر مسلمان کی یہ تمنّا تو ہر سن اور ہر وقت رہنا ہی چاہیئے۔

(س) بہ طفیلِ حضرت والا حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضری اور بیعت نصیب ہوئی اور اس کے بعد تعلق تربیت صرف حکیم محمد مصطفٰے سے ہوگیا اور جلد ہی وفات حضرت حکیم صاحب سے سلسلۂ تربیت ہی ختم ہوگیا۔ للّٰہ اب اپنے ہی دامن میں اس نامۂ سیاہ کو پناہ دیجئے اور کسی طرح زندگی ٹھکانے لگا دیجئے۔

(ج) پناہ تو تمامتر اللّٰہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ظاہری سہارے کی حد تک دونوں بزرگوں کی تعلیم و تلقین ان شاء اللّٰہ کافی ہوجائے گی۔

(س) موت اور مابعد الموت کا تصوّر دل ہلا دیتا ہے۔ بے اختیار گریہ طاری ہوجاتا ہے۔ نماز بالخصوص تنہائی کی نمازوں میں قرآنی مضامین دل تڑپا دیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے سجدے ہی میں زمین شق ہوجاتی اور ناپید ہوجاتا۔

(ج) ساری کیفیات مُبارک و محمُود ہیں۔ ماشاء اللّٰہ۔

(س) اس کی عظمت و کبریائی کے حقوق تو کیا ادا ہوں گے بڑا سوال سراپا معصیت کی مغفرت کا ہے۔

(ج) بڑا اور اصل سوال تو سب کے لیے یہی ہے۔

(س) انجام کی دہشت ناکی سے کسی طرح چین نہیں ملتا۔

(ج) آخر یہ فکر و بے چینی رہی تو انشاء اللّٰہ چین اور دائمی بے فکری لائے گی۔

(س) خدا کے لیے دستگیری فرمائی جائے تاکہ آخرت سنور جائے۔

(ج) دستگیر تو سب سے بڑھ کر اپنی ہی طلب اور اپنی ہی طبیعت خود ہوتی ہے، ان شاء اللّٰہ!

(۱۵)

ابتلاء اور غم کی مصلحتیں

یہ مخلص مدیر صدق کے خانگی المیہ کے کوئی ۴، ۵ مہینے بعد ملنے آئے اور قدرۃً پہلا موضوع گفتگو تعزیت ہی رہا۔ اس کے بعد وطن جاکر یہ خط لکھا ــــ

(س) جدائی سے آنجناب پر جو اثر ہے اس سے دل شدت کے ساتھ متاثر ہوا۔

(ج) اور یہ علامت مومنانہ رقتِ قلب اور مخلصانہ اثر پذیری کی ہے۔

(س) اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا انوکھا اور نرالا رہتا ہے۔ اس غم واندوہ کے پردے میں اس کی کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوں گی۔

(ج) اور کیسی کچھ اور بلکہ اسی کے قطعی یقین واذعان ہی نے تو ابتلاء کو قابلِ برداشت بنادیا بلکہ ایک طرح کی لذت و دل کشی بھی درد و سوز میں پیدا کردی ہے۔

(س) اور درجاتِ مراتب کی کتنی بلندیاں اس بہانے مل گئی ہوں گی۔

(ج) اتنے نصیب اپنے کہاں؛ ہاں انشاء اللہ ازالہ و کفارہ معاصی تو ایک حد تک ہو گیا ہوگا۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ــــ انچہ در وہمت نیاید آں دہد

گر نہ دیدی سود او در قہر او
کے شدے آں لطف مطلق قہر جو

پیمبر تو شفقتِ خلق اور رقتِ قلب میں سب سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے اور حضرت یعقوبؑ کی شدتِ گریہ اور شدتِ غم وبکا کا حال تو خود قرآنِ مجید نے بہ صراحت بیان کر دیا ہے اور وہ بھی جب آپؑ مرگِ فرزند کی خبر کو غلط سمجھ رہے تھے۔ اس درجہ تفصیل و تصریح کی ضرورت آخر کیا تھی؟ سوا اس کے کہ ایک پیمبر کے نمونے سے انسانیت کو تعلیم دینا مقصود ہو۔ اور اللہ ہم ناتوانوں کو پیمبروں ہی کے نقشِ قدم پر چلنا نصیب کرے!

(س) آخرت پر پورا ایمان رکھنے کے باوجود بھی یہ کم دیکھنے میں آیا ہے کہ جانے والے کے جاچکنے کے بعد اس کی عاقبت کی فکر اس درجہ شدومد کے ساتھ متعلقین کو ہو۔ اس کی اہمیت کا تقاضہ یہی ہے۔ اپنے تجربے میں آنجناب کو اس معاملہ میں منفرد پایا۔

(ج) یہ جو کچھ اور جس درجہ میں بھی نصیب ہوا، اللہ کے فضل و کرم سے بعض بزرگوں خصوصاً حضرت تھانویؒ کی صحبتِ بابرکت کے طفیل میں ہے ——— غم والم جس شدت سے چاہے منائیے اس پر کوئی قید اُدھر سے نہیں۔ سوا اس کے کہ اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کا نکتہ برابر پیشِ نظر رہے ...... دل اور آنکھ اپنے اختیار کی چیزیں نہیں ہیں، ان دونوں پر جو کچھ گزرے، گزر جانے دیجئے۔ زبان البتہ اپنے بس میں ہے ذمہ داری شروع اسی سے ہوتی ہے اور ختم بھی اسی پر ہوتی ہے۔ بس اس پر بجز الحمد للہ کے اور کچھ نہ آنے پائے۔

(س) صدق میں مولانا محمد طیب صاحب دیوبندی کا مضمون بڑا ہی مفید اور قیمتی نکل رہا ہے۔

(ج) جی ہاں۔ اور اس المیہ کی مصلحتوں اور برکتوں کی ایک کھلی ہوئی مثال تو یہی مقالہ ہے۔ نہ یہ صورتِ حال واقع ہوتی اور نہ یہ بیش بہا مقالہ وجود میں آتا۔

(س) ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے بھی حسنِ عاقبت کے بارے میں آنجناب کو جیسا متفکر پایا، اس سے بڑا سبق ملا۔

(ج) ان سے دیرینہ تعلقاتِ نیازمندی کا عین مقتضا بھی یہی تھا۔

(س) اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے انھیں بہرہ مند کرے۔

(ج) آمین! کام کی بات ان کے حق میں یہی دعائیں ہیں۔

(س) قرض کی مصیبتِ عظمیٰ میں گرفتار ہوں اور پھر کسی ایک کا نہیں، آٹھ دس کا قرضدار ہوں۔ ان کے تقاضوں کے کچوکے سے، بیان نہیں کر سکتا کہ کس درجہ پریشان ہوں۔

(ج) اس تکلیف کا احساس جتنا بھی پیدا ہو سکے اچھا ہے۔ یہ سب کچھ سہنا تو بہر حال پڑے گا، اور یہ پریشانی بھی آپ کے حق میں مفید ہوگی۔ اتنی بُری لت اپنے پیچھے لگا لینا اور اپنے کسی ذاتی شوق کے پیچھے پڑ کر اپنی حیثیت معیشت کا بالکل اندازہ نہ کرنا ناعاقبت اندیشی کی ایک بدترین مثال اور ایک ہلکے قسم کی خودکشی ہے۔ فضیحت اور رسوائی تو اس کے لیے بطور لازمہ کے ہیں اور چونکہ یہ امر اختیاری ہے اس لیے قرضدار کے ساتھ قدرتاً وہ ہمدردی بھی نہیں پیدا ہوتی جو

کسی غیبی اور غیر اختیاری حادثہ کے موقع پر پیدا ہو جاتی ہے۔

(س) میں نے اب ہر مسرفانہ خرچ سے توبہ کی اور کان پکڑے ہیں اور اب ہر خرچ میں انتظام اور کفایت کا اہتمام کیا ہے۔

(ج) خیر۔ اللہ عزم میں استقلال پیدا کرے۔ لیکن کئی ہزار کی رقم محض اتنے انتظام سے جلد نہیں پاٹی جا سکتی۔ اپنے نفس کی تادیب اس کے لیے لازمی ہے اپنے کو نیم فاقہ کشی یعنی آدھے پیٹ کھانے پر آمادہ کرنا ہوگا۔ شوقینی کے ہر خرچ کو اپنے حق میں زہر قاتل سمجھنا ہوگا اور ہم چشموں اور برادری والوں سے بخل کے طعنے سننے ہوں گے۔

(س) آیۂ کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ورد شروع کر دیا ہے اور درود شریف کی کثرت۔ اور اگر جناب کے خیال میں کچھ اور بھی ضروری ہو تو اسے بھی شروع کر دوں۔

(ج) آمدنی بڑھانے کے لیے بعض بزرگ ان آیات کا ورد بھی کراتے ہیں۔ یہ سارے اوراد اور وظیفے اپنی جگہ اچھے ہیں اور باعثِ برکت۔ لیکن برکت کے دائرہ کو بہت ہی محدود سمجھے رہیے اور خوش عقیدگی کو کام میں لا کر اسے کافی نہ سمجھیے۔ امورِ اختیاری میں بزرگوں کی دعائیں تک زیادہ کارگر نہیں ہوتیں۔ اس دائرہ میں انھیں تدبیروں کو عمل میں لانا چاہیے جو عادت اللہ یا فطرت نے ان کے لیے معمولاً مقرر کر دی ہیں۔ مثلاً غذا ہے۔ اس کے لیے سارے درمیانی مدارج کے پاپڑ آپ کو بیلنے ہوں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کسی اہل اللہ کی دعا سے لقمہ اڑ کر آپ کے منھ تک خود بخود پہنچ جائے۔

(۱۶)

چند تاریخی سوال

(س) حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت محمد بن حنفیہ کو قید کر کے قتل کی دھمکی دی۔ اس میں صرف استحکامِ خلافت کا خیال فرمایا۔ نہ قرابت کا لحاظ فرمایا نہ جزوی بزرگی کا تصور دل میں آیا۔ میرے نزدیک حضرت ابن زبیرؓ کا فعل نہایت مستحسن اور آئینِ جہاں بانی کے بالکل موافق تھا، اور ایسا ہی ہونا تھا۔ اس باب میں میری تسکین فرما دی جائے۔

(ج) اغلب اور قرینِ قیاس یہی ہے۔ لیکن نفسِ واقعہ تاریخی اپنی تفصیل کے ساتھ ذہن میں محفوظ نہیں۔ اور کتابوں کی طرف مراجعت کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

(س) (ایک بڑی لمبی عبارت، جس میں تاریخی حوالوں سے یہ ذکر ہے کہ یزید نے واقعہ کربلا سے اپنی سخت بیزاری اور تبری تو کر دی اور ابن زیاد پر لعنت بھی بھیجی لیکن سلطنت کمزور تھی۔ اتنے بڑے افسر کے خلاف صابانہ کوئی عملی کارروائی کرنا مناسب نہ معلوم ہوئی۔ جیسا کہ بعد کو خلیفہ منصور

اور خلیفہ مامون الرشید کو بھی اپنے اپنے زمانے میں مصلحتاً بعض مفسدوں کے معاملہ میں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔)

ج ذاتی رجحان اپنا بھی یزید کی معذوریوں ہی کی جانب ہے اور ہر کلمہ گو کے لیے رہنا چاہیے۔ لیکن اوّل تو واقعۂ کربلا اپنی شدّت و اہمیت میں ان دوسری مثالوں سے کہیں بڑھا ہوا تھا اور پھر بڑی بات یہ کہ ان تاریخی بحثوں میں بہت زیادہ وقت صرف کرنا اور کسی ایک قطعی فیصلہ کے درپے ہو جانا، دینی و دنیوی کسی اعتبار سے بھی نہ ضروری ہے نہ مفید۔ اس لیے ایک سرسری اور ترجیحی رائے قائم کر کے جلد ان سے گزرتے ہوئے چلے جانا چاہیے اور کسی سے ان بحثوں میں زیادہ الجھنا ہرگز سُودمند نہیں۔ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا نیتوں کا علم عالم الغیب ہی کو پورا ہو سکتا ہے۔ چہ جائیکہ آج سے صدہا سال قبل کا ماحول اور آج سے بالکل ہی مختلف قسم کا تمدّن۔ اور اس کے درمیان نیتیں بھی بادشاہوں اور حکمرانوں کی! محفوظ اور اسلم طریقہ یہی ہے کہ ایک عام اور محتاط حسنِ ظن کے بعد فیصلہ عالم الغیب ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

س (ایک مناجاتِ منظوم اس تمنائے دلی کے بیان میں کہ وقت آخر تو ماہ مبارک (رمضان) کے آخری عشرہ میں جمعہ کے دن ساعتِ سعید میں۔ زبان پر کلمۂ شہادت اور آیاتِ غفران کے ساتھ ہو)

ج ان شاء اللہ۔

تمنّا اور دُعا کا اجر تو بہرحال مل ہی گیا۔ اب آگے مصلحتِ تکوینی قبول دُعا کے ساتھ جو معاملہ بھی چاہے کرے۔

س قریب بیسؔ دن سے زائد ہوئے زیرِ یونانی علاج ہوں۔ خدا صحت و قوت

عطا فرمائیے دعا کیجیے۔

(ج) اللہ شفا دے۔

(س) علی الصباح طبیعت سست اور نڈھال ہو جاتی ہے اس لیے بعض دن ذکر اذکار ناغہ ہو جاتے ہیں۔

(ج) ضرور علاج و تدبیر غور و توجہ سے کرنا چاہیئے۔ اس معذوری سے اذکار میں خلل پڑ جانے کا مطلق مضائقہ نہیں۔

(س) افسوس ہے کہ خادم کا دل تا حال دنیوی الجھنوں اور گرد و غبار سے آلودہ ہے دنیوی تعلق سے دل کو پاک کس طرح کرنا چاہیئے؟

(ج) جو ترک علائق مقصود ہے وہ اختیاری و ارادی ہے عقلاً و ارادۃً بندہ اپنے کو طول امل میں نہ پھنساوے، اور اس کا واحد ذریعہ ادائے عبادات و فرائض اور ترک منہیات و معاصی کا ہے۔ اس کی تفصیلات سے حضرت تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات و تصانیف بھرے پڑے ہیں، ان کا مطالعہ جاری رکھنا ان شاء اللہ بہت مفید و معین ہو گا۔

(س) خدا کی شدت کہ اب تک اس نے ظاہری اسباب رزق کی کشادگی کے پیدا نہیں کیے۔ اور خاطر خواہ آمدنی کی سبیل پیدا نہیں ہوئی نہ معلوم کب پیدا فرمائیں گے۔

(ج) یہ مالی ابتلاء تو اس وقت مسلمانانِ ہند کے لیے عام ہے باقی کچھ نہ کچھ تو ہر دور اور ہر ملک میں رہتا ہی ہے۔

(س) رزاقیت پر عین الیقین نہ ہونے سے خادم کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے لہٰذا عین الیقین پیدا کرنے کی کوئی صورت تجویز فرمائیں۔

(ج) بندہ مکلّف صرف اپنے ارادہ و اختیار کی حد تک ہے۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر کیفیاتِ قلب کے پیچھے پڑ جانا اپنے کو خواہ مخواہ ضیق و تعب میں مبتلا کرنا ہے ـــــ اگر ایسا کوئی تعویذ یا عمل یا وظیفہ ایجاد ہو گیا ہوتا تو پھر مجاہدہ اور اجرِ مجاہدہ کے کوئی معنی ہی نہ رہ جاتے۔

(س) دُعا و توجہ کا سخت محتاج و خواہاں ہوں۔ معاف فرمایئے دل کے جذبہ کے ماتحت لکھ رہا ہوں۔

(ج) دُعا و توجہ بھی ایک درجہ میں مؤثر ہو سکتی ہے۔ لیکن فلاحِ دارین کا اصل مدار بندہ کی اپنی ہمت و عمل پر ہے۔

(س) کچھ دن سے پھر خیال پیدا ہوا ہے کہ کہیں کاروبار کی غرض سے چلا جاؤں خیال ہوتا ہے کہ کلکتہ یا چٹگاؤں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جا کر دیکھوں کہ کوئی سبیل خدا پیدا کر دیتا ہے۔

(ج) اگر تجربہ یا مشورہ کی بنیاد پر اس کی اُمید بڑھ رہی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔

(س) رات کو تہجد کے بعد جب سویا تو عجیب و غریب خواب دکھائی دیا، جس سے سخت تردّد ہے۔ (اس کے آگے ایک لمبا خواب درج ہے)۔

(ج) خواب کو تو یوں بھی کوئی خاص بنائے تردّد نہ بنانا چاہیئے اور پھر اس خواب میں تو سرے سے کوئی بات تردّد انگیز نہیں۔

(س) رات کو عجب اتفاق ہوا کہ نیند قریب ایک بجے کے ٹوٹی۔ اس کے بعد سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ کچھ خوف و پریشانی معلوم ہوئی۔ اٹھ کر وضو کیا۔ اور نمازِ تہجد ادا کی۔ عجب اتفاق کہ حضرت خواجہ اجمیری اور حضرت سیدنا مرشدنا حاجی امداد اللہؒ اور مولانا تھانویؒ اور .... کی یاد

یکے بعد دیگرے شروع ہوئی اور دل پر عجب رقّت طاری ہوئی۔ میں نے فرداً فرداً ہر ایک کے لیے دُعائے مغفرت کی اور کچھ آیات تلاوت کر کے ایصال ثواب کر دیا۔ بعدہٗ جمیع انبیاء و اصحاب کرام و تمام اولیاء کرام کے لیے بھی دُعا کر دی۔ اس کے بعد سویا تو مندرجہ بالا خواب دکھائی دیا۔

(ج) کیفیت مُبارک رہی۔ رقّتِ قلب، صالحینِ اُمّت اور حضرات انبیاء کی یاد ان سے تعلقِ قلب کی تجدید وغیرہا سارے اجزاء مُبارک ہی ہیں۔

(۱۷)

نماز کی پابندی اور جماعت کا اہتمام

(س) نمازِ پنجگانہ کی توفیق تو ہو جاتی ہے لیکن گھر میں پڑھ لیتا ہوں۔ مسجد جانے سے محروم ہی رہتا ہوں۔

(ج) الحمدللہ کہ پابندیٔ نماز کا اہتمام ہے۔ تھوڑی سی بھی توجہ سے نماز با جماعت کا اہتمام بھی ممکن ہے۔ ہاں کوئی خاص اور قوی معذوری حائل ہو۔ مثلاً مسجد کا زیادہ فاصلہ پر ہونا، تو وہ قابلِ معافی ہو سکتی ہے۔ جماعت کے شرف و فضل سے مستقل محرومی ایک بڑی محرومی ہے۔

(س) دوسری بڑی کمی اپنے میں یہ پاتا ہوں کہ اب تک کسی سے بیعت نہیں ہو سکا ہوں۔

(ج) بیعت ضروری ہے یا نہیں۔ یہ خود ایک پیچیدہ مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

(س) ایک بڑی رکاوٹ اس راہ میں مسئلہ تصورِ شیخ بنا ہوا ہے۔

(ج) اور تصورِ شیخ تو خود ایک اختلافی و نازک مسئلہ ہے ان نازک بحثوں میں خواہ مخواہ کیوں اُلجھئے۔

(س) ترکِ جماعت کیا کوئی سخت معصیت ہے؟

(ج) ترکِ جماعت بلا عذرِ معقول سخت معصیت اگر نہیں تو معصیت کی طرف

لے جانے والا تو ہے اور بہر حال قابل ترک۔

(س) مناجات مقبول وغیرہ میں قرآنی اور حدیثی دُعائیں درج ہیں. کیا ان کے لیے بھی اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ بعض صاحبوں نے ڈرا دیا ہے کہ انھیں بلا اجازت پڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔

(ج) قرآنی اور حدیثی دُعائیں تمام تر انعامِ الٰہی ہیں۔ ہر مسلمان ان کا حقدار اور قدرتی وارث ہے۔ خطرہ وغیرہ کے اوہام پیشہ ور "عاملوں" کے تراشے ہوئے ہیں۔

(س) ایک فکر یہ رہا کرتی ہے کہ اگر بیعت کی جائے تو کس سے؟

(ج) جب بیعت ہی کا لزوم مسلم نہیں تو کسی متعین شخصیت کا مسئلہ تو بعد کی چیز ہے ہر شخص کا معیار الگ الگ ہوتا ہے جس پر دل تجربہ کے بعد زیادہ جمے، ترجیح اسی کو دینا چاہیئے۔

(س) ملک کی ایک مشہور دینی درس گاہ کے طالب علم کا اطلاعی خط کہ ان کے والد کا وطن ہند اور ان سے صدہا میل کے فاصلہ پر دفعتاً انتقال ہو گیا۔

(ج) والد کا وجود یوں ہی ایک نعمتِ بے بدل ہی ہوتا ہے اور اسی لیے اس حادثہ انتقال پر جتنا بھی طبعی صدمہ ہو، بجا ہی ہوتا ہے اور پھر جب انتقال بغیر کسی تیاری کے، دفعۃً اپنی آنکھوں سے صدہا میل دُور ہو جائے تو اس طبعی صدمہ کا بدرجہا بڑھ جانا بھی بالکل طبعی ہے اور پھر جب والد ایسے ہوں جنھوں نے اپنی اکلوتی اولاد کو، بجائے دنیوی ترقیوں کا خیال کیے دینی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور ملک کے دور دراز حصہ میں بھیج کر اپنی نظروں سے جدا کر دیا تو اس پڑے ہوئے طبعی صدمہ میں ایسے

محسن مربّی کے لیے عقلی صدمہ کا بھی اضافہ کسی درجہ کا ہو جاتا ہے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ط

ضرورت اس کی ہے کہ اس قرآنی فقرہ کو محض رسماً نہ دُہرا لیا جائے بلکہ اس کا شعوری طور پر بھی کچھ تھوڑا بہت مراقبہ کر کے دیکھا جائے۔ پہلا استحضار تو واضح طور پر اس کلیہ کا ہونا چاہیے کہ ہم سب کیا باپ اور کیا بیٹے، کیا ماں اور کیا بہن اپنا کوئی مستقل و قائم بالذات وجود ہی نہیں رکھتے۔ سب کے سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سب کو ظاہری خلعتِ وجود چھوڑنا ہوگا۔ بلکہ استحضار اس کا بھی پورا ہونا چاہیے کہ ہم سب کے سب کیا بڑے اور کیا چھوٹے، کیا عزیز و رفیق اور کیا حبیب و محبوب چل بھی اسی اللہ کی طرف رہے ہیں۔ یہاں رہنے کے لیے قیام کے لیے کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ سب کو آگے پیچھے اس ایک منزل کی طرف جانا ہے جتنا واضح استحضار ان دونوں حقیقتوں کا رہے گا، انشاء اللہ قلب کو تقویت ہی رہے گی۔ اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ مغفرت و رحمت سے نوازے۔

(س) (ایک انگریزی درسگاہ کے استاد کا خط) تعمیل ارشاد کر دی ہے۔ کیا عرض کروں کہ آج کل فرصت کتنی کم رہتی ہے۔

(ج) جزاک اللہ۔ ہر دینی خدمت کا اجر اسی مناسبت سے بڑھتا رہتا ہے۔

(س) گھریلو ذمہ داریاں سرکاری وقت کے بعد بھی لڑکوں کو ...... پڑھانا اور اس پر مستزاد خود اپنے امتحان کی تیاریاں۔ ایک عجیب الجھن رہتی ہے۔

اطمینان اور سکون کے ساتھ پڑھنے اور سوچنے کا موقع اب نہیں ملتا۔ بہرحال کوشش اپنی والی یہی رہتی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا کام کچھ نہ کچھ ہوتا رہے اور کوئی نہ کوئی پروگرام بھی ذہن میں رہتا ہے۔

(ج) اور یہی معنی ہیں کشمکشِ حیات کے۔ مشغولیتیں، الجھنیں اور ذمہ داریاں ــــ ساری عمر اسی میں کٹ جاتی ہے۔ بس اسی میں جتنا بھی موقع حق اور دین کی خدمت کا مل جائے، اور انشاء اللہ وہ ضرور مل جاتا ہوگا۔ اور یہ تو یہاں نہیں وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ ہم جنہیں خالص دنیوی کام سمجھتے تھے ان کا لمحہ بھی اور گھنٹے بھی اعمالِ حسنہ ہی کی مد میں شمار کر لیے گئے ہیں۔ اکبر کا شعر ہے تو وہ ایک دوسرے موقع کے لیے لیکن کام اس سے یہاں بھی لیا جا سکتا ہے

حشر تک کھل نہ سکے، راز اسے کہتے ہیں
جستجو پھر بھی کرو، ناز اسے کہتے ہیں

(۱۸)

مُصیبت اور مُجاہدہ کی حکمت

(س) (ایک ہندی مہاجر عرب کا مکتوب - اپنے نوعمر لڑکے کی بڑی شدید اور طویل اور نہایت تکلیف دہ علالت کے دردناک حالات درج کرنے کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ہمارے صبر کا امتحان لے کر اس پندرہ سالہ لڑکے کو آخر شفا دے دی۔

(ج) الحمدللہ کہ مہینوں کے طویل انتظار اور امید وبیم اور شدید تڑپ اور دُکھن کے بعد بالآخر نورِ نظر کو شفا ہوگئی۔ جس سے قدرۃً والدین کے دل میں بچے کی قدر اور زیادہ بڑھ گئی ہوگی ـــــ اور جہاں آپ نے اپنے صبر کے سخت امتحان کا ذکر کیا وہیں کچھ موٹا سا اندازہ اس اجر اور انعامِ بے حساب کا بھی کر لیا ہوتا جو صبر کرنے والے والدین کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

(س) جس میں بزرگوں کی توجّہ اور دُعا کا دخل بھی ضرور ہے۔

(ج) اور اس سے بھی بڑا اور سب سے زیادہ دخل خود رحمتِ کاملہ کا ـــــ دوا یا دُعا سب شکلیں تدبیر ہی کی ہیں اور ہر فضل وکرم، رحم وہمدردی کے عقب میں ارحم الراحمین ہی کا رحم وکرم ہوتا ہے۔

(س) بے شک اللہ تعالیٰ حاکم و حکیم ہے۔ مگر اتنے معصوم بچّہ (۱۵ سال کی عمر والے) کو اتنی تکالیف میں مبتلا کرنے میں ان کی کیا حکمت ہے؟

(ج) معاذ اللہ! کیا آپ کا خیال دُنیا کے کسی اور درد ناک واقعہ کی حکمت و مصلحت کی طرف بھی گیا؛ کیا آپ کے خیال میں دُنیا جب سے قائم ہوئی ہے کیا یہی پہلا واقعہ اس نوعیت کا اس درجہ کا درد ناک ظہور میں آیا ہے؟ کیا بے شمار و بے حساب اسی درجہ کے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر درد انگیز و صبر آزما بلکہ اس سے بھی بڑھ بڑھ کر ہر دور اور ہر زمانہ میں پیش نہیں آتے رہے ہیں۔

اس خاص واقعہ کو چھوڑیے۔ کائنات کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کی بھی حکمت کا احاطہ کوئی ایک بھی عقل بشری کر سکی ہے؟ پھر اس مخصوص واقعہ ہی پر توجہ کے لیے اتنا تعب کیوں؟ کیا یہ کوئی ساری کائنات سے الگ ہے؟ اگر ہے تو اس پر کوئی دلیل؟ اور اگر الگ نہیں تو جو وجہ ساری ہی دُنیا کی بے رحمی اور مظلومی کی ہوتی ہے وہی اس واقعہ کی بھی ہوسکتی ہے۔

(س) آج جبکہ ہندوستان چھوڑنے کا وقت آیا ہے، دل بھر آیا ہے اور اس وقت نہایت بھولے بھالے دل سے یہ سطریں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں جہاں ہم سے اتنا بڑا مجاہدہ کرایا گیا اور صبر و برداشت کا سبق دیا گیا وہیں یہ حسرت بھی ایک مجاہدہ ہی سمجھتا ہوں۔ اللہ اسے ہمارے گناہوں کا کفارہ کر دے۔

(ج) اللہ ایسا ہی کرے اور امیدیں اسی قسم کی قائم کرنا چاہئیں۔

(س) اس سن کے بچے تو بے گناہ اور معصوم ہیں۔ ان کا گناہ میں پڑنے کا

کوئی سوال ہی نہیں۔

(ج) اوّل تو اس سن کے بچّے کو قطعی بے گناہ و معصوم سمجھ لینا ہی قولِ بلا دلیل ہے۔ زیادہ سے زیادہ نیم معصوم فرض کر لیا جائے اور پھر رہا سوال کسی بے گناہ کو دنیا میں کسی تکلیف میں مبتلا کرنے کا، تو یہ اللہ نے کہاں کہا ہے؟ ابتلا کی حکمتیں بیسیوں ہو سکتی ہیں۔ ان کی تعداد و تعیین سمجھ کے زمرہ سے قطعی باہر ہے۔

(س) پھر اس میں کیا بھید اور مصلحت ہو سکتی ہے؟

(ج) کسی کو اپنے کو امورِ تکوینی و اسرار کا عالم سمجھ بیٹھنا بہ خود ایک بڑی گستاخی اور آدابِ عبدیت کے تمام تر منافی ہے اور صرف اس عذر پر قابلِ تحمل ہو سکتا ہے کہ شدید صدمہ سے متاثر ہو کر دماغ ہی اپنا کچھ توازن کھو بیٹھا ہو۔

(س) بار بار دل و دماغ سے یہ سوال ٹکرا کر رہ جاتا ہے۔

(ج) نعوذ باللہ۔ جس طرح شیطان کے دل و دماغ سے یہ سوال ٹکرا کر رہ گیا تھا کہ جب اللہ نے مجھے باعتبارِ خلقت آدم سے بہتر بنا دیا ہے تو پھر مجھے اس کے آگے جھکنے اور گرنے کا حکم کیسے دے رہا ہے۔

(س) اگر حضرت چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دیں تو تسلی ہو جائے گی۔

(ج) صرف اللہ کے کسی بندہ کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔ عوامِ اُمّت کی تو کیا خواصِ امت بلکہ مقبولینِ کاملین کی بھی یہ مجال نہیں کہ وہ اسرارِ کائنات تک پہنچ سکیں۔ بس صرف یہ دعا ممکن ہے کہ اللہ آپ کے دماغ کو تسکین و تسلی دے اور دل سے اس پراگندگی کو دور کر کے اسے سکینت و صبر سے لبریز کر دے۔

(س) پچھلے سال عریضہ میں عرض کیا تھا کہ آپ کے "سفر حجاز" کو پڑھ کر قصد حج بیت اللہ کر لیا ہے۔ بحمد اللہ کہ ابھی سال ۱۳ فروری ۱۹۶۹ء کے جہاز سے روانگی کی اجازت مل گئی ہے۔

(ج) کاش ایسے مخلصوں کے طفیل میں مصنف "سفر حجاز" کو بھی کوئی چھوٹا سا درجہ عطا ہو جائے۔

(س) آپ فرمائیں کہ حضرت کے لیے وہاں کیا دعا کروں؟

(ج) بندے کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تعداد تو بے حساب ہوتی ہے جامع و کامل ترین دعا "عافیت دارین" کی ہے سب کچھ اسی میں آگیا۔

(س) آپ احقر کے لیے دعا قبولیت حج کی فرمائیں۔

(ج) اللہ پوری طرح قبول عطا فرمائیں اور اس کے طفیل میں اس بدحال کو بھی کچھ نہ کچھ نصیب ہو جائے۔

(س) اہلیہ کی صحت و شفائے کلی کے لیے بھی درخواست دعا کرتا ہوں۔

(ج) شافی برحق شفائے عاجل و کامل عطا فرمائیں۔

گھر میں پچھلے ہی ہفتہ وطن سے دور بالکل ہی دفعۃً چند منٹ کے اندر وفات پا گئیں۔ ان کے حق میں بھی ہر ممکن موقع پر دعائے مغفرت فرماتے رہیں۔

(۱۹)

ذکر و مراقبہ

(س) حضرت ...... سے دُوری کے باعث اب کوئی ہدایت نہیں لے سکتی ہوں۔ اللہ کے واسطے آپ ہی ہدایت فرمایئے۔ مراقبۂ اسم ذات میں مدظلہٗ نے فرمایا تھا کہ لفظ اللہ بخطِ نور دل پر لکھا ہوا تصوّر کرو۔ بہ خطِ نور ہونا تو بڑی بات ہے۔ میرا تو تصوّر ہی اللہ پر نہیں جمتا۔ جس وقت مراقبہ کرتی ہوں، کوئی طاقت مجھے دیر تک مراقبہ سے روکتی ہے۔

(ج) صوفیاء و مشائخ کے یہاں یہ جو اصطلاحی ضابطے رائج ہیں ان سے اس عاجز کو نہ کوئی خاص دل چسپی ہے اور نہ کچھ زیادہ واقفیت۔ اس لیے ایسے امور میں مشورہ دینے سے معذوری ہے۔

بجز اس عام مشورہ کے کہ مرشدوں کے تجربہ میں جو تدبیریں مفید و مؤثر ثابت ہوئی ہیں ان کی تعمیل بھی اپنے حدودِ وسعت و تحمل کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔

(س) دل چاہتا ہے کہ دل کا ذکر اس طرح جاری ہو کہ سوتے جاگتے برابر جاری رہے۔ کسی وقت بھی دل غافل نہ ہو۔

(ج) بزرگوں سے سننے میں یہ آیا ہے کہ دوام حضور اپنے اصلی و لفظی معنی میں تو ممکناتِ عادیہ میں سے ہے نہیں۔ البتہ کوشش میں لگے برابر رہنا چاہئے اور دانستہ غفلت کا تدارک بھی اختیاری ہوتا ہے۔

(س) زبان سے پڑھنے کی تو کثرت ہے۔

(ج) بندہ مکلف بس اتنے ہی کا ہے۔

(س) حضرت موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ دُعا اللہ سے جاری رہے۔

(ج) یہ ہدایت تو بہر صورت واجب العمل ہے اور بہ آسانی ممکن العمل بھی۔

(س) دُعاؤں کی قبولیت کا یقین اتنا زیادہ ہے کہ شام سے صبح تک اور صبح سے شام تک یقینِ واثق رہتا ہے کہ آج اللہ کی مدد ظاہر ہوگی۔

(ج) نزول امدادِ الٰہی کا یقین تو باعثِ برکت ہے۔ لیکن یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ مدد عین ہماری تمنّا اور ہمارے اندازہ ہی کے موافق ہوگی۔

(س) جب شام ہوجاتی ہے اور کوئی ذریعہ نجات کا اپنے اضطرابات سے ظاہر نہیں ہوتا شکستگیٔ قلب بڑھ کر دل کی حالت نازک ہوجاتی ہے۔

(ج) یہ مایوسی تو اپنے ہی ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا اس کا بھی کہیں وعدہ ہے کہ دُعا جس صورت میں بھی مانگی جائے گی، اسی وقت اور اسی صورت کے ساتھ قبول کرلی جائے گی۔؟

(س) زبان پہ اللہ کا کلام، احادیث کی دعائیں جاری ہیں۔ آنکھوں سے بارانِ آنسو رل کا جاری ہے۔ ع

بچیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اللہ کے واسطے دستگیری کیجئے۔ جواب پرسکون دیجئے اور عملی راہ

بتلایئے ۔

(ج) عملی راہ صرف طریقِ عبدیت کی ہے ۔ یعنی دعائیں کر کے نتیجہ تمامتر اللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دے ۔ سکونِ قلب صرف اسی طرح ممکن ہے ۔ باقی یہ راہ تو مشرکوں کی ہے کہ دیوتاؤں کو اپنے جنتر منتر سے اپنا مطیع و مسخر بنا لیا جائے اور برہمن اپنے اشلوکوں کے زور سے ان سے سب کچھ کرالیں ۔

حق تعالیٰ نہ کوئی دیوی دیوتا ہیں جنھیں اشلوکوں سے مغلوب کر لیا جائے اور نہ کوئی جن یا مؤکل جسے عملیات سے اپنا تابع بنا لیا جائے ۔ وہ ہر حال میں حاکم ہیں سب سے بڑے ۔ جن پر کسی مخلوق کا نہ اثر ہے نہ دباؤ ۔ اور حکیم ہیں سب سے بڑھ کر جن کی حکمتیں اور مصلحتیں ہر بڑے سے بڑے مقرب بندے کی بھی گرفت سے بالاتر ہیں ۔ بس ان دو صفاتِ باری کا استحضار اگر رہے تو دعا سے متعلق ساری بے اطمینانی دور ہو سکتی ہے ۔

(س) سید .... صاحب نے سات مرتبہ یٰسٓ شریف پڑھ کر رسول اللہؐ سے لے کر اور لوگوں تک بخش کر دعائیں کرنے کو کہا وہ بھی کرتی ہوں ۔ ہر فرض نماز کے بعد دعائیں کرتی ہوں ۔ ہر اللہ کا برگزیدہ بندہ مجھ پر مہربان ہو کر دعائیں کرتا ہے مگر ہنوز روزِ اوّل ہے ۔ جو کچھ بزرگوں نے بتایا وہ سب کیا ۔ اب کیا کروں ، کہاں جاؤں ۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

(ج) یہ تو عین عبدیت ہے اور ساری ریاضتوں اور مجاہدوں کا حاصل ۔ دعا کوئی سی بھی ہو اور کیسی ہی مجرب در مجرب ، بہر حال بندہ کی طرف سے ایک درخواست ہی ہے ۔ حاکمِ مطلق و حکیمِ مطلق کے حضور میں جس کی منظوری تمامتر اور بلا کسی شائبہ استثنار کے اسی مالک و مولیٰ کے اختیار میں ہے ۔

نعوذ باللہ کیا اللہ پر کبھی کسی طرح کا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے ۔؟

(س) میر ولی الدین حیدر آبادی کی کتاب 'مراقبات' سے بہت سکون ہوا۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کو راضی کرتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے ۔

(ج) اور ٹھیک لکھا ہے ۔ لیکن اس رضا کا ظہور تو دارالجزاء میں ہوگا۔ اس رضا کے یہ معنی نہیں کہ تکوینیات میں ہر کام بندہ کی مرضی کے مطابق ہونے لگے ۔

(س) لیکن میں تو توبہ واستغفار دعا اور پڑھنے رونے سے تھک جاتی ہوں ۔
نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

(ج) جواب اوپر گزر چکا ہے ۔
ایک شعر مثنوی کا بھی سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے ؎

خوش نماید گریہ شبہائے تو
ذوقہا دارم بہ یارب ہائے تو

اشارہ اوپر سے یہ ہو رہا ہے کہ اے بندہ تو جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا ہے یہی چیز تیری قدر ہمارے یہاں بڑھا رہی ہے ۔ تیرا یہ "یارب، یارب" کہہ کر چلاتے رہنا خود ہمارے یہاں تیری جگہ پیدا کر رہا ہے ۔

(۲۰)

پردہ اور علمی و مذہبی خدمات

(س) (ایک پاکستانی خاتون کی طرف سے) میری آرزوئیں اور تمنائیں تو میری بساطِ اہلیت سے کہیں زائد ہیں۔

(ج) یہ دعویٰ قابلِ قبول اس وقت ہوگا جب آپ کو علم بھی اپنی بساط و اہلیت کا پورا اور صحیح ہو۔ اور جس کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں وہ بس خاموشی سے اسے سُن لے گا۔

(س) مثلاً میرا دل چاہتا ہے کہ حضرت مجدد کے حالات پر ایک لمبی کتاب لکھوں جو ان تمام کتابوں کا نچوڑ ہو جو اب تک حضرت کے حالات و سوانح پر لکھی جا چکی ہیں۔

(ج) ماشاءاللہ! حوصلہ و ولولہ تو بہر صورت قابلِ داد ہے۔

(س) لیکن اب تک ہر کتاب تشنہ و نامکمل ہے۔ نسیم احمد فریدی کا تذکرہ بھی مکمل نہیں ہے۔

(ج) تصنیفی دنیا میں "تکمیل" کا دعویٰ یوں بھی مشکل ہی ہے "فَوْقَ کُلِّ ذِی عِلْمٍ عَلِیْمٌ" ہر آخری لفظ کے بعد بھی کھلتا ہے کہ نہیں

وہ آخری نہ تھا اور پھر جب والہانہ عقیدت بھی شریک ہو جائے جب تو قدم کسی منزل پر بھی پہنچ کر رکنے پر نہ آئے گا۔

(س) مگر پھر ڈر کر سہم جاتی ہوں کہ پاک و ہند میں ایک سے ایک عالم و فاضل موجود ہیں جو خفا ہو اٹھیں گے کہ یہ ناقص العقل بھی دخل در مذہب و تصوّف کرتی ہے۔

(ج) مگر یہ صنف ناقص العقل تو بہت سے میدانوں میں اور بہت مرتبہ مردوں کو دنگ و حیران بنا چکی ہے۔ عورت کو مطلق صورت میں ناقص العقل ٹھہرا لینا خود بہت ہی مبالغہ آمیز اور دُور از حقیقت ہے۔

(س) .... میں اگرچہ پردہ نشین ہوں

(ج) جیسا کہ ہر مومنہ کو ہونا ہی چاہیئے۔

(س) مگر پردہ علمی و مذہبی خدمات میں رکاوٹ نہیں کرتا۔

(ج) بے شک! اور بی بی عائشہ صدیقہ رضؓ سے لے کر شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال تک ہر دور میں اپنی بساط و ظرف کے مطابق امّت کی بڑی بڑی باحجاب اور عصمت مآب خاتونوں نے علمی و دینی ہر قسم کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

(س) میری ہمشیرہ محترمہ کا اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا اور ان کے بچھڑ جانے سے زندگی زندگی نہیں لگتی اور کسی صورت دل نہیں بہلتا۔ باوجودیکہ نماز روزہ کی پابند ہوں اور کچھ ذکر و ظائف بھی معمولات میں شامل ہیں۔ شوہر بھی نیک اور محبت کرنے والے ہیں مگر طبیعت کا سکون اُجڑ کر رہ گیا ہے حد یہ ہے کہ نماز اور قرآن شریف کا لطف اور کیف جو ہمشیرہ کی موجودگی میں

تھا وہ اب نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ مجھ پر رحم فرمائے۔

(ج) آمین! اللہ ہر طرح صبر توفیق فرمائے۔

یہ طبعی کیفیات جتنی بھی لکھی ہیں۔ سب بندے کے اختیار سے باہر ہیں۔ غیر ارادی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے ان پر کسی مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ بلکہ اس درجہ غم اور صدمہ کو ضبط کرنا اور فرائض میں اس سے فرق نہ آنے دینا تو اجر کو اور بڑھانے والی چیز ہے۔

(س) کیا قرآن مجید میں خودکشی کی ممانعت ہے؟

(ج) جی ہاں۔ بالواسطہ تو بالکل صاف ہے۔ مثلاً ان آیتوں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ کسی کی جان نہ لو، سوائے اس کے کہ اس کا قانونی جواز موجود ہو۔ —— اور کسی کے قتل کی ممانعت میں خود اپنے قتل کی ممانعت بھی شامل ہے اور براہ راست والی آیتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

(س) خودکشی مجازی نہ ہو بلکہ اصلی اور حقیقی ایک فرد کی نہ کہ ایک گروپ (Group) کی۔ ممانعت صریح اور "بدیہی" نہ ہو اور ایسے الفاظ میں ہو جن سے کوئی اور نتیجہ نکالنا بالکل ناممکن ہو۔

(ج) ممانعت صریح تک تو خیر، لیکن یہ مطالبہ کی ممانعت "بدیہی" بھی ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسے لفظوں میں ہو کہ کوئی دوسرے معنی بالکل ناممکن ہوں" تو احکام و نواہی کیا معنی بنیادی عقائد تک کے لیے بھی شاید ہی پورا کیا جا سکے —— اور یہ مطالبہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی منکر کی طرف سے کسی نبی سے یہ فرمائش ہوتی کہ کوئی ایسا معجزہ پیش کیجیے جو اپنی دلالت

میں سو فی صدی واضح ہو اور جس کی کوئی دوسری تاویل و توجیہ سرے سے ممکن ہی نہ ہو ــــــ ظاہر ہے کہ اس عالم کسب و اختیار میں نہ ایسا کوئی کلام ممکن ہے نہ ایسا کوئی عمل، کہ اس کے بعد مخاطب مسلوب الاختیار ہو جائے، اور اس کے لیے گریز اور انکار، شک و اشتباہ، تاویل و توجیہ کے سارے ہی راستے بند ہو جائیں۔

(س) قتل عمد کے ساتھ التباس بھی ناممکن ہو۔ سورت اور آیات کا حوالہ دیجیے گا۔ بہت مشکور ہوں گا۔

(ج) قلب سلیم کے لیے تو یہ جواب کافی ہے کہ جن امور کی طرف سے فطرتِ بشری میں طبعی کراہت، طبعی دہشت اور طبعی گریز رکھ دیا گیا ہے ان کی حرمت و ممانعت کے لیے کسی صریح حکم تشریعی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے چنانچہ یہ کہیں وارد نہیں ہوا ہے کہ اپنے فضلات جسم کو کھانے پینے کے کام میں نہ لاؤ۔ حیوانوں سے جنسی تلذذ نہ حاصل کرو، سانپ بچھو کو نہ کھاؤ ــــــ ان سب سے فطرتِ بشری خود شدید انکار رکھتی ہے اور حکیم مطلق نے اسی طبعی انکار کو کافی رکھا ہے۔ حبِ حیات جوہر نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے اس کے بعد خودکشی کی ممانعت کا لفظی حکم قطعی غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

باقی اگر کسی "حکم" ہی کی تلاش ہے تو پہلے تو وہ آیتیں ذہن کے سامنے لے آئی جائیں جن کا یہ مضمون ہے، کہ کسی بھی انسان کی جان لینا حرام ہے تاوقتیکہ اس کا کوئی قانونی جواز نہ موجود ہو اور کسی کی جان لیتے

کی ممانعت میں دوسرے کی جان لینے کی طرح اپنی جان لینا بھی شامل ہے۔

اور پھر ان دو آیتوں کو پڑھ لیا جائے جن سے متعدد مفسروں نے خودکشی ہی کی ممانعت مراد لی ہے:

(۱) وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ؕ

"اپنے ہاتھوں سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو"

(البقرۃ آیۃ ۱۹۰)

(۲) وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ "اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو"

(النساء آیۃ ۲۶)

(۲۱)

سورہ رحمٰن کی تفسیر

(س) سورۃ الرحمٰن کی آیات یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت الخ اور یرسل علیکما شواظ من نار میں جن و انس دونوں کی استطاعت کو چیلنج خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے جو اللہ قدیر و قوی کے شایانِ شان بھی ہے۔ جنوں کا صعود تو معروف ہے لیکن انسانوں کو اقطار السمٰوٰت والارض سے جس "نفوذ" پر چیلنج ہے اس سے کیا مراد ہے۔ کیا موجودہ دور کی خلائی پرواز کی طرف یہ مشیر ہے؟

(ج) (۱) اقطار السمٰوات والارض سے باہر نکل جانے کی نفی جن و مخلوقات کی کی گئی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امکان نفوذ ہر دو جنس مخلوقات میں سے ہر ایک کے لیے "آسمانوں" سے بھی پرے ہے بلکہ محض مجموعہ آسمان و زمین سے امکان نفی کافی ہے جیساکہ اسی سورۃ کے پہلے رکوع میں آیہ کریمہ یخرج منہما اللؤلؤ والمرجان سے یہ لازم نہیں کہ بحرین (بحرِ شیریں و بحرِ شور) میں سے ہر ایک میں

لُولُو، اور مرجان دونوں پائے جاتے ہیں۔ کسی ایک ہی صنف کے بحر میں پایا جانا مجموعہ پر اطلاق کی صحت کے لیے کافی ہوگا۔

(۲) اشارہ موجودہ خلائی پرواز کرنے والوں کی طرف بھی بالکل صحیح ہوسکتا ہے

(س) اور "شواظ" "نار" سے جو استقبال مذکور ہے وہ کیا موجودہ اور خلائی طیاروں کا فضائے بے کراں میں جل کر خاکستر ہوجانا ہے؟ جیسا کہ ابھی حال ہی میں بعض خلائی پرواز کرنے والوں کو پیش آچکا ہے۔ یا اللہ علیم و خبیر کا مقصد اس سے کچھ اور ہے۔؟

(ج) مقصد تو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور عام ہے لیکن ایسے واقعے اور حادثے بھی اس عموم کے تحت آسکتے ہیں۔

(س) ایک مدت سے عریضہ ارسال نہ کرسکا۔ خیال کئی بار ہوا اور لکھنے کا ارادہ بھی کیا لیکن آج کل بھی دیر برابر ہوتی رہی۔

(ج) کیا مضائقہ ہے دُنیا کے جھمیلوں میں پڑکر دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔

(س) اپنا حال وہی ہے یعنی ارادہ کرنے اور کرانے کا بہت کچھ۔ لیکن عمل صفر سارا دن گورکھ دھندوں میں گزر جاتا ہے۔

(ج) وہی سنت پدری یاسنت ابوالبشری۔ حضرت آدمؑ کے لیے بھی تو یہی ارشاد ہوا ہے: وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ قوتِ ارادی کا ضعف یہی تو انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔

(س) کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جس میں اپنی ذہنی و رُوحانی تسکین و انشراح کے لیے کچھ مطالعہ یا سوچ بچار کا کام ہو۔ یہ نہیں ہے کہ شادی کی وجہ سے خدانخواستہ

کسی خاص قسم کی پریشانی پیدا ہو گئی ہو۔

(ج) پریشانی نہ ہو لیکن احساسِ ذمہ داری تو غیر شعوری طور پر بڑھ ہی جاتا ہے اور بڑھ جانا چاہیئے بھی۔

(س) رمضان شریف کے مہینے میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ کلام پاک کے مضامین سے ناواقفیت بڑے شرم اور محرومی کی بات ہے۔ اس تاثر کے تحت اس زمانہ میں ترجمہ اور تفسیر کے مطالعہ کا کچھ شغل رہا ___ لیکن پابندی اس کی بھی نہ ہو سکی۔

(ج) پابندی مسلسل نہ سہی، پھر بھی جب خیال آجائے از سرِ نو شروع کر دینا چاہیئے ___ توبہ شکنی اگر بار بار ہو سکتی ہے تو تجدید توبہ بھی بار بار کیوں نہ ہو!

(س) انگریزی ادب میں بھی مطالعہ بڑھانے کا خیال ہوتا ہے۔ (یہ صاحب انگریزی ادب میں ایم اے ہیں)۔

(ج) اگر یہ مطالعہ تنہا مقصود بالذات نہ ہو بلکہ اسے خدمتِ دین وملّت کا ایک ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ مطالعہ عین عبادت بن جائے گا۔

(س) لیکن ضابطہ کے ساتھ کام کرنے کی نوبت نہیں آتی۔

(ج) اور دینی نیت کے بھی شامل کر لینے سے ان شاء اللہ داعیہ قوی بن جائے گا۔

(س) عبادات میں جو کچھ بن پڑتا ہے وہ خشوع وخضوع سے خالی ہوتا ہے۔

(ج) اگر یہ عدم حضوری، غیر ارادی بلکہ خلاف ارادہ ہے تو اس پر کیا مواخذہ ___؟

(س) اس لیے بے جان سی معلوم ہوتی ہے۔

(ج) عجب نہیں کہ اخلاص و ندامت کی آمیزش اس بے جان میں جان ڈال کر اسے جان دار بنا دے۔

(س) اور معاملات میں تو نفس کی خباثت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

(ج) یہ کھل کر سامنے آجانا تو عین نعمت و احسان ہے اور ہر "خباثت" کا علاج اس کے مقابل کی "شرافت" ہے۔

(س) "صدق" میں "عمر کا ۶۵ واں سال" نظر سے گزرا اور بہت پسند آیا اور اپنے لیے کئی وجہوں سے خاص طور پر موثر ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ حیات میں برکت دیں اور اسے اپنے قرب کا موجب بنائیں۔

(ج) مخلصوں کی دعائیں دل سے نکلی ہوئی، خود ایک سرمایۂ عظیم ہیں۔ جزاک اللہ۔

(س) گھر میں یہیں ہیں۔ حمل کا زمانہ بھی چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ خیریت سے اس مرحلہ سے گزار دیں۔

(ج) اللہ تعالیٰ ہر طرح مبارک کرے۔ لڑکا پورا مرد باپ بننے کے بعد ہی بنتا ہے اور لڑکی پوری عورت ماں بننے کے بعد ہی۔ ساتھ ہی ساتھ دونوں کی ذمہ داریوں اور فکرمندیوں میں بھی کس درجہ اضافہ ہو جاتا ہے! ہر رشتہ و تعلق کے شرعی و عقلی تقاضوں کو نباہنا بھی تو کمال انسانیت ہے اور تکمیل اسلام و ایمان۔

(۲۲)

توحیدِ وجودی

(س) کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل میں ؟

(ج) آگے جواب میں جو کچھ تحریر ہوگا کسی عالم دین کے نہیں، ایک عامی کے قلم سے ہوگا۔

(س) کیا توحیدِ وجودی وشہودی میں تطبیق دی جاسکتی ہے ؟

(ج) اہلِ فن نے تطبیق دی تو ہے —— مسئلہ صرف اہلِ فن کے کام کا ہے ہم عوام کو اس سے الگ ہی رہنا بہتر ہے۔

(س) کیا یہ صحیح ہے کہ توحید وجودی افلاطونی فلسفہ اور ویدانت سے مشتق ہے ؟

(ج) جی ہاں خیال تو ایسا ہی ہوتا ہے، باقی وہی پہلا مشورہ یہاں بھی ہے۔

(س) کیا تزکیۂ نفس کے لیے مُرید ہونا ضروری ہے ؟

(ج) "مرید" اصطلاحی معنی میں ہونا ضروری نہیں۔ باقی نفس ارادت یا عقیدت اگر نہ ہوگی تو نفع آخر کیونکر حاصل ہو سکے گا۔

(س) علماء واتقیاء کی صحبت تزکیۂ نفس کے لیے کافی نہیں۔

(ج) عالم یا بزرگ کو عالم یا بزرگ سمجھ کر اس سے طویل ہم صحبتی خود ہی ایک صورت مرید ہونے کی ہے۔

(س) خط کے ذریعہ مُرید ہونا کیسا ہے اور اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

(ج) صحبت اگر نہ میسّر آ سکے تو کسی حد تک اس کی قائم مقامی اس سے ہو سکتی ہے۔

(س) پیرانِ چشت مزامیر سے سماع سنتے ہیں۔

(ج) اس کی صحت میں کلام ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلوی سے تو مزامیر پر انکار صراحت کے ساتھ منقول ہے۔

(س) اور پیرانِ نقشبندیہ سماع کے قائل نہیں ہیں۔

(ج) مسئلہ کی اصل یہی ہے۔ جن کا اکابر چشت سے سننا منقول ہے۔ انھوں نے زمان، مکان، اخوان کی بڑی احتیاطوں کے ساتھ سنا ہے۔ بہ طور علاج جیسے حاذق و تجربہ کار طبیب اپنے تجربہ کی بنا پر بعض اوقات نشیلے اور زہریلے اجزاء بھی اپنے نسخے میں شامل کر لیتے ہیں۔

(س) جھنڈوں کو اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے؟ امام حسینؓ کا جھنڈا، پیرانِ پیر کا جھنڈا قائم کرنا کیسا ہے؟

(ج) تمام تر لغو ہے۔

(س) ان کا ادب واحترام اور ان کی سلامی درست ہے کہ نہیں؟

(ج) بے اصل ہے۔

(س) ہر حکومت و ملک کا جھنڈا ہوتا ہے۔ ملکی جھنڈے اور سوال مندرجہ بالا والے جھنڈوں میں کیا فرق ہے؟

(ج) ایک کی بنیاد مذہبی عقیدت ہے اور دوسرے کی تمام تر ملکی تنظیم، وطنی اتحاد اور قانونی احترام۔

(س) اس کا ادب و احترام و سلامی درست ہے کہ نہیں؟

(ج) بالکل درست ہے۔ اگر صرف قانونی احترام تک محدود رہے اور کوئی شائبہ پرستش کا نہ پایا جائے۔

(س) بعض اوقات یہ بات خیال میں آتی ہے کہ جو شیطانی وسوسہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس رحمت والے کی رحمت پر جب بخشش کا دار و مدار ہے تو عبادات کی احتیاج ہی کیا ہے۔؟

(ج) سوال افعالِ الٰہی کی حکمت سے متعلق ہے اور اس طرح کے سوالات کے جواب میں بارہا یہ حقیقت گزارش کی جا چکی ہے کہ حکمت تکوینی تخلیقی کوئی ایک بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ ہر حکمت جو بندہ فرض کر کے بیان کرے گا معاً اس پر وارد ہو جائے گا کہ خود اس حکمت ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اس لیے عقل ہی کا مشورہ ہے کہ سوالِ حکمت کو سرے سے چھیڑا ہی نہ جائے۔

اور دراصل ایک ہی سوال تو ہے جو مختلف اور متعدد وسوسوں کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ کبھی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بدی کیوں پیدا کی۔ کبھی یہ کہ کافروں منکروں کی تعداد زیادہ کیوں رکھی۔ وقس علیٰ ھذا۔ ایسے سوالات میں پڑنا تقاضائے عقل نہیں خلافِ عقل ہے —— سائل کے ذہن سے ہر ایسے موقع پر یہ حقیقت بالکل نکل جاتی ہے کہ سوال کس ذات سے متعلق ہو رہا ہے۔ اس کا استحضار رہے تو سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہو۔ باقی عام

اور سہل سا جواب یہ ہے کہ عبادت تو محض ایک ذریعہ یا سبب کشش رحمت کا ہے اور رحمت اور سبب رحمت کے درمیان ہرگز کوئی تعارض نہیں۔ پھر اگر یہ شبہ ہو کہ رحمت کو کسی سبب پر کیوں موقوف فرمایا گیا ہے تو یہ سوال تو بجنسہ اس عالم اسباب کے ہر ہر واقعہ پر ہو سکتا ہے۔ زراعت کو بارش پر کیوں مشروط رکھا ہے؟ بچہ کی پیدائش کو زن و مرد کی یکجائی پر کیوں؟ موسم کی گردش ارضی مداری پر کیوں؟ وقس علیٰ ھٰذا

اور وہ قادر مطلق جب چاہے، بلا واسطہ اسباب بھی ہر نتیجہ پر یکساں قادر ہے۔

(س) وہ تو بے نیاز ہے۔

(ج) سوال میں اہل جاہلیت کی طرح یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خالق کسی درجہ میں بندوں کی عبادت کا محتاج رہتا ہے۔ یہ مفروضہ ہی بے بنیاد ہے۔ عبادت یا روحانی ورزش تو بندوں ہی کی عبدیت کے تکملہ اور نشو و نما کے لئے ہے۔ جس طرح ورزش سے جسم کو صحت و قوت حاصل ہوتی ہے اور اس لیے حکم عبادت کی کوئی خفیف سی بھی زد عقیدہ قضائے خداوندی پر نہیں پڑتی۔

(س) جب کوئی تکلیف ہوتی ہے تو فوراً بدگمانی اللہ سے پیدا ہونے لگتی ہے۔؟

(ج) اگر یہ بدگمانی محض آتی اور فوری رہتی ہے تو اضطراری اور طبعی ہے اور قابل معافی۔ اور اگر سمجھ بوجھ کر اور ارادۃً کی جاتی ہے اور دیر تک اسے قائم رکھا جاتا ہے تو نفس کا ایک شدید ترین مرض ہے جس پر استغفار

واجب ہے اور عقل و فہم کی روشنی میں ایسے بے بنیاد و خطرناک واہمہ کو دُور کرنا ہے۔

(س) اگرچہ جانتا ہوں کہ آزمائش ہے لیکن بعض وقت دل ایسا گھبراتا ہے، کہ پڑھنا لکھنا سب چھوڑ دوں۔

(ج) "اگرچہ جانتا ہوں" الخ۔ اسی جاننے ہی میں تو کلام ہے۔ یہ علم اگر صحیح و راسخ ہوتا تو دل کی گھبراہٹ کافور ہو جاتی۔ لکھنا یہ تھا کہ: "اگرچہ یہ مقولہ دوسروں سے سُنا ہے لیکن اپنے دل میں یہ بات ابتک نہیں اُتری ہے" الخ۔ ___ حکیم مطلق کی حکمتوں اور مصلحتوں پر اگر اجمالی عقیدہ بھی نہیں تو ایک طرف ایمان ناقص رہے گا اور دوسری طرف ساری زندگی بے اطمینانی، وحشت اضطراب و خفقان کی نذر ہو جائے گی۔ قناعت سکون و اطمینانِ قلب تمامتر اعتماد علی اللہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس دولت کے حصول کا بڑا ذریعہ وہیں لکھنؤ کی بعض بیدار قلب و زندہ روح شخصیتوں (مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سلمہ اللہ) کی طویل صحبت ہے۔ پھر اچھی کتابوں (مثلاً حضرت تھانویؒ کے مواعظ) اور اچھے رسالوں (مثلاً ماہنامہ صبحِ صادق، ماہنامہ الفرقان کے معارف الحدیث اور صدق کے انھیں کالموں) کا مسلسل مطالعہ اور نفس کو ہیجان میں لانے والی صحبتوں، گفتگوؤں، کتابوں اور رسالوں سے کامل اجتناب۔

(س) بعض وقت دل میں آتا ہے کہ سب چھوڑ دوں اور اطمینان سے گھر پر کام سیکھوں۔

(ج) آخر وہ کون سا کام ہے جو گھر پر رہ کر بلا کسی قسم کی محنت اور تعب کے سیکھا جا سکتا ہے؟ اور عربی تعلیم (خصوصاً ندوہ جیسے مدرسہ) میں وہ کون سی فوق الحد محنت اٹھانا پڑتی ہے جو اسے چھوڑ بھاگنے کا سودا یوں سر پر سوار ہے؟ —— خواہش بالکل بچوں کی سی ہے جو نہایت کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اس کا اندازہ ہی نہیں رکھتے کہ دنیا کا چھوٹا بڑا کوئی سا بھی مشغلہ ممکن نہیں جو معتدل درجہ کی فکر و تردد سے خالی ہو۔

(س) آخر پڑھ کر کیا کروں گا۔ کہاں نوکری ملے گی؟

(ج) کیا علم صرف 'نوکری' ہی کے لیے حاصل کیا جاتا ہے؟ —— اور پھر نوکری بے پڑھے کون سی مل جائے گی؟

علم دین کی قدر کیا اب بس اتنی رہ گئی ہے کہ اگر اس سے ملازمت نہ حاصل ہو تو وہ سرے سے بیکار رہی ہے؟ انسان کے انسان بننے اور مسلمان کے مسلمان بننے کی کوئی قیمت ہی نہیں؟ —— کیا علم دین جنھوں نے حاصل کیا یا اب کر رہے ہیں وہ سب فاقہ ہی کر رہے ہیں؟

علم دین، علم معاش کے ہرگز منافی نہیں۔ دونوں کی تحصیل ساتھ ساتھ بھی جاری رہ سکتی ہے۔ اور بہترین صورت یہ ہے کہ علم دین میں بقدر ضرورت پختگی درسوخ حاصل کر کے علوم معاش کی طرف متوجہ ہوا جائے اور ان میں سے جو علم و فن اپنے مناسب حال معلوم ہو اس کی طرف پوری توجہ کی جائے۔

(۲۲)

ترکِ صلوٰۃ

(س) ایک معزز بوڑھے دیندار باپ کا خط۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لڑکا ایک بڑے عہدے پر فائز ہے اور نہایت فرض شناس و دیانت دار ہے۔ لیکن نماز کا یکسر تارک۔ حضرت تھانویؒ کی کتابیں مطالعہ کو دی گئیں۔ انھیں حقارت سے رد کر دیا۔ کسی بزرگ کی تلاش جن کی دعا تیر بہدف ہو)

(ج) ہر دعا جب انبیاء کی مقبول نہ ہوئی تو دوسرے بزرگوں کا کیا ذکر ہے اسلئے ایسے بزرگ کی تو تلاش بھی بے سود ہے جن کی ہر دعا قطعی اور حکمی ہو۔

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں عام سنت اللہ یہ ہے کہ بندہ میں جب تک خود کسی درجہ میں طلب نہیں پیدا ہوتی، غیب سے ہدایت نہیں ہو جایا کرتی۔ اور یہ طلب پیدا کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ابوجہل اور فرعون اس کی روشن مثالیں ہیں۔ طلب اپنے اندر ذرا سی بھی پیدا نہ ہوئی بلکہ الٹا عناد اور جمود قائم رہا۔ پیمبرانہ تبلیغ، تلقین، دعائیں۔ سب بے اثر رہیں۔ خاص الخاص اولاد ہی کی مثالیں ڈھونڈھنا ہوں تو قابیل (پسر آدمؑ)، کنعان (پسر نوحؑ) اور دس فرزندانِ یعقوبؑ (برادرانِ

یوسفؑ) موجود ہیں۔

آپ صبر کریں کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ حضرت تھانوی کی کتابیں منکرین کے لیے نہیں مسلمین کے لیے ہیں۔ ہاں حضرت کی ایک کتاب الانتباھات المفیدہ مع شرح از حکیم محمد مصطفےٰ مرحوم، ممکن ہے کچھ مفید ثابت ہو۔

آپ کے علاقہ میں حضرت کے ایک خلیفہ مولانا .... ثم .... کی تعریف بہت سننے میں آئی ہے۔ گو ذاتی نیاز ان سے حاصل نہیں بہر حال ہو سکے تو ان سے بھی مل کر گفتگو کر لیجیے۔

پڑھنے کے لیے کتابیں اگر دوسرے لوگوں کی دی جائیں تو ممکن ہے کہ کچھ موثر ہوں۔ مثلاً اقبال کی، مولانا سید سلیمان ندوی کی، مولانا مودودی کی۔ نومسلم ASADWEISS کی تازہ "THE ROAD TO MECCA" مولانا محمد علی کی "MY LIFE AFRAGMENT" اور محمد علی لاہوری احمدی مرحوم کی بھی کتابیں دکھانے میں مضائقہ نہیں۔

کراچی کے دو انگریزی پرچے ایک پندرہ روزہ الاسلام دوسرا ماہنامہ "VOICE OF ISLAM" بھی اگر مطالعہ میں رہیں تو بہتر ہے۔

(س) قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر تقریباً ہر پارہ اور ہر سورۃ میں موجود ہے ..... بہر حال ایک ہی بات کئی بار دہرائی گئی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میں نے آپ کے حسب ہدایت اپنے استاد تفسیر مولانا ..... صاحب سے سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضور صلعم کے

مثیل تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ حضور صلعم سے قریب تھا اور بہت ملتا جلتا ہوا بھی تھا۔ دونوں رسولوں کے طریقے اور شریعت بھی ایک تھے مختصر فرق کے ساتھ۔

یہ باتیں ٹھیک ہیں لیکن ایک ہی بات کا ذکر بار بار سمجھ میں نہیں آیا۔

(ج) تو سوال اب محض تکرار ذکرِ موسویؑ پر نہ رہا بلکہ وسیع ہو کر نفس مکررات قرآنی پر ہو گیا۔ یعنی قرآن میں کسی چیز کا بھی ذکر بار بار کیوں آیا ہے۔ جنّت کی نعمتیں دوزخ کے ڈراوے، صفات باری مثلاً رحمت، قدرت، حکمت، علم وغیرہ اور نماز، زکوٰۃ اور ابراہیمؑ وغیرہ دوسرے انبیاء کا ذکر بار بار اور کثرت سے کیوں آیا ہے؟

سوال اگر اور کسی تکرار پر نہیں پیدا ہوتا ہے صرف اسی تکرار ذکر موسوی پر پیدا ہوتا ہے تو اس تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ —— اگر سب پر پیدا ہوتا ہے۔ تو اوّل تو یہی کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک اتنی ضخیم کتاب میں کوئی ذکر ایک سے زائد بار نہ آنا چاہیے۔ اور پھر قرآن مجید اصطلاحی معنی میں "کتاب" ہی کب ہے۔ یعنی ایسا مجموعہ اوراق جو بہ یک وقت مرتب ہو کر شائع ہوا ہو۔ وہ تو خود مختلف موقعوں پر ۲۲، ۲۳ سال کی لمبی مدت میں نبی کریمؐ کی زبان سے بہ طور خطبہ کے ارشاد ہوا ہے۔ تکرار بیان اس صورت میں تو لازمی سی ہوتی ہے۔

جس طرح آج بھی صاحب فہم اُستاد شاگرد کے دل کے اندر جو بات اتارنا چاہتا ہے اسے صرف ایک دفعہ کھول کر بیان کر دینے پر اکتفا

نہیں کرتا بلکہ وہ اسے بار بار مختلف موقعوں پر اور ہر مرتبہ ایک نئے سیاق کے ساتھ بیان کرتا ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ طریقہ تعلیم بڑا مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جو بشارتیں اور جو ڈراوے، جو وعدے اور جو وعیدیں ہیں، چاہتا ہے کہ مخاطبین کے دل پر چھا کر رہیں اور ان کے شعور ولاشعور دونوں کے لیے بچنے اور غیر متاثر رہنے کی گنجائش نہ رہ جائے ایسے مضامین کے لیے وہ اسی کثرت تکرار کے اصول پر عمل کرتا ہے اور کہیں وہ عبارت بجنسہٖ اور کہیں ذرا ادل بدل کر برابر لاتا رہتا ہے۔

انبیاء کے تذکروں میں اس عموم میں ایک خصوص ہے۔ کہیں وہ قصہ اس غرض سے لایا جاتا ہے کہ نبی کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرایا جائے۔ کہیں نبی کی آزمائش کا ذکر مقصود ہوتا ہے کہیں نبی کے اجر وانعام پر توجہ دلانی ہوتی ہے۔ کہیں اس نبی کی قوم اور عرب میں مماثلت کا اظہار مدنظر ہوتا ہے۔ کہیں اس نبی کی شریعت اور احکام اسلام میں مطابقت دکھانا ہوتی ہے اور اسی طرح کے اور متعدد مقاصد ہیں ____ تو انبیاء کے تذکروں میں علاوہ اس عام اصول (یعنی تکرار کے ذریعہ اثر اندازی) کے۔ یہ سب مقصد اپنی جگہ کار فرما رہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو ہمارے رسولؐ کے ساتھ اور شریعتِ موسوی کو شریعت مصطفوی کے ساتھ نسبتِ خاص نہیں نسبت اخص حاصل ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے اور اس بنا پر ذکرِ موسوی کی کثرت تکرار بالکل قدرتی ہے ____ اور جس نسبت سے جس نبی کو خصوصیت ہمارے رسولؐ کے ساتھ حاصل ہے اسی نسبت سے اس کا ذکر بھی قرآن

میں تکرار و تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ چنانچہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت ابراہیمؑ کا نمبر ہے۔

قرآن مجید کے بعد روئے زمین کے پردہ پر کسی کتاب "آسمانی" کا پھر اگر وجود ہے تو توریت ہی کا ہے۔ انجیل موجودہ جو ہے اس کے کسی جزو کے بھی کتابِ آسمانی ہونے کا دعویٰ مسیحوں کو نہیں۔ مستند اناجیل اربعہ کو وہ صرف ملفوظاتِ حضرت مسیح حسبِ روایت فلاں و فلاں قرار دیتے ہیں۔ دوسری اناجیل کا درجہ اس سے بھی فروتر۔

(س) والدین کی خدمت کرنا لڑکے پر جبکہ اس کا زمانہ ملے اور خدمت نہ کر کے جنّت سے محروم رہنا بہت بڑی بدبختی ہے۔ میں اتنی دُور رہ کر اس ثواب عظیم سے محروم ہوں۔ میرا یہ خیال تو قطعی نہیں کہ میں پڑھنا چھوڑ کر خدمت شروع کر دوں۔ لیکن بھائی صاحبان خدمت کر کے ہم سے بڑھ رہے ہیں۔

(ج) کیا ان بھائی صاحبان نے بغیر باہر گئے ہوئے اور بغیر دُور رہ کر دینی تعلیم حاصل کیے ہوئے یکلخت خدمتِ والدین شروع کر دی تھی؟۔ سوال عجیب سیدھے پن کا ہے۔ خدمتِ والدین کے قابل اسی تعلیم ہی نے تو انھیں کیا؟ اور اس تعلیم کے حصول کی کیا شکل بجز باہر رہ کر تعلیم پانے کی ہے؟

پھر جس راستہ کا مقصود ہی خدمتِ والدین کی منزل تک پہنچنا ہو اس پر چلنے سے آخر اجر کٹنے بلکہ گھٹنے ہی کیوں لگا؟ وہ تعلیم بھی تو عین خدمتِ والدین ہی ہے۔ اس سے الگ کیسے ہوئی؟

(س) کیا کوئی صورت ہے کہ میں بھی ان دونوں اجروں سے محروم نہ رہوں اور بھائیوں کا اجر مجھ سے نہ بڑھے۔

(ج) اب کب ان دونوں اجروں سے محرومی ہو رہی ہے؟ اور بھائیوں سے پیچھے رہ جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

(س) (ایک تعلیم یافتہ معزز شخص کے لمبے خط کا خلاصہ):

..... مسجد ..... کے معاملہ میں میرے دلچسپی لینے سے برادرانِ وطن سب مجھ سے خفا ہو گئے۔ اور ..... جیسے ذی اثر افسر کی توجہ تو خاص طور پر میرے اوپر ہو گئی۔ یہاں تک کہ ..... کے مقدمہ میں مجھے پھنسا دیا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ جرم کی سزا جیل ہے اور میرا جیل جانا اب ۹۰ فیصد یقینی ہے۔ شروع میں میرا دل مضبوط تھا اور میں نے طے کیا تھا کہ ہنستا کھیلتا ہوا جیل جاؤں گا۔ لیکن پیشی کے بعد سے دل بڑی کمزوری محسوس کر رہا ہے حالانکہ دوسروں کے سامنے اب بھی کوشش سے اپنے کو نڈر بناتے ہوئے اپنے کو بشاش رکھتا ہوں۔ آپ میرے حق میں دل سے دعا فرمائیں اور یقین رکھیں کہ میں سراسر مظلوم ہوں۔ محض ..... کی سازش اور اثر سے پھانس دیا گیا ہوں۔

(ج) اپنی عزت کا خیال تو قدرتی ہے اور اپنی رسوائی اور اذیت دونوں کے اندیشہ سے متاثر ہونا بھی امر طبعی ہے اور امور طبعیہ میں تاثر سے انبیاء کرام تک محفوظ و مستثنیٰ نہیں۔

لیکن شرط یہی ہے کہ غم وصدمہ کا یہ تاثر بس حدود کے اندر ہی رہے اور قلب کو اس کا استحضار ہر وقت رہے کہ بے گناہ کا جیل جانا تو عین سنّتِ یوسفی ہے۔ اس استحضار سے قلب کو صبر ہی نہیں شکر کی بھی توفیق میسّر آجائے گی۔

یہ یقین رہے کہ مومن کے لیے ہر اذیت اور ہر بلا (جو اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہ ہو) ایک مستقل اجر رکھتی ہے اور کسی بڑی راحت کی تمہید ہی ہے ـــــ اور مُربّیِ حقیقی جس کا جتنا ظرف دیکھتا ہے اس پر آزمائش بھی اسی درجہ کی ڈالتا ہے۔

ان حقائق کے یاد رکھنے سے انشاءاللہ دل قوی ہوجائے گا۔

باقی لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم اور حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا ورد بھی دن رات اُٹھتے بیٹھتے جتنا بھی ہوسکے، برابر جاری رہے خصوصاً ہر نماز کے بعد توبہ وخشوع سے دُعا کے ساتھ۔

(۲۴)

دُعا کی حقیقت

(س) جب بچّہ پر بخار کا حملہ ہوا بر وقت طبّی امداد پہنچائی گئی اور دُعا بھی جاری رہی۔ ۲۷ رمضان المبارک کو جبکہ بچہ کا مزاج بہت ہی خراب ہو چکا تھا، گھر کا گھر دُعاؤں میں رہا اور خاص کر احقر اس دن نمازِ عصر سے مغرب تک انتہائی کرب و خلوص کے ساتھ بارگاہِ ربّ العزّت میں دست بدعا رہا۔ آخر کار بعد افطار نورِ نظر دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

(ج) مُبارک ہو کہ حقِ اجر آپ لوگوں کو سو فیصدی حاصل ہو گیا اور ارادی عبادتوں کے اخلاص میں جو کمی رہ جاتی ہے اس کی پُوری تلافی اس نیم اضطراری، نیم اختیاری مجاہدہ دُعا و تضرع نے کر دی، اور گھر بیٹھے آپ کو وہ دولت مل گئی جو کسی دوسری صورت سے نہ مل سکتی ——— پھر باوجود اس قدر رجوع الی اللہ کے اس معصوم بچّہ کا دنیا سے گزر جانا اور آپ لوگوں کے حق میں سونے پر سہاگا ثابت ہوا۔ اس اجر کو اور بدرجہا (اَضْعَافًا مُّضَاعَفًا) بڑھا دینے والا ———

بچے کے بچ جانے کی صورت میں دل پر وہ چوٹ اور وہ حسرت کہاں نصیب ہوتی جو اجرِ کامل کو اکمل بنا دیتی ہے اور بچے کی ماں کے حق میں تو بچے کے شافع ہو جانے پر نص حدیث بھی موجود ہے۔

(س) اب یہ وساوس و خیالات آرہے ہیں کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم روزہ دار کی دعاؤں کو رد نہیں کرتے اور ہم روزہ کا بدل ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اب اس ناقص خیال میں عجیب و غریب سوالات اُٹھ رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا اللہ تعالیٰ نے اسے شفا کیوں نہ دی۔؟

(ج) سوال کا منشا اور مبنیٰ یہ مفروضہ ہے کہ مقبول بندہ کی ہر دعا کا قبول ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن جب مشاہدہ قدم قدم پر اس مفروضہ کی تردید کر رہا ہے اور اولیاء کاملین کیا معنی خود انبیاء مرسلین کی ہر دعا کا قبول نہ ہونا بلکہ بعض کا صریح رد ہو جانا قرآن و حدیث دونوں سے کھلم کھلا ثابت ہے تو پھر اس مفروضہ کا کیا وزن رہ جاتا ہے اور کسی محض روزہ دار یا چند روزہ داروں کی دعاؤں کے نامقبول رہ جانے پر حیرت کیوں ہے؟

دعا کسی کی بھی ہو اور کسی غرض و مقصود کے لیے ہو اس کے بعینہٖ قبول ہو جانے کا وعدہ کسی حال میں بھی قرآن و حدیث میں مذکور نہیں۔ قرآن مجید میں تو صرف یہ ہے کہ "وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" مجھے پکارے جاؤ میں تمہاری خوب سنتا ہوں، مجھے غافل نہ سمجھو (جیسا کہ بہت سی جاہل قوموں نے اپنے خداؤں کے لیے سمجھ رکھا ہے)۔

وعدہ صرف یہ ہے کہ کوئی دعا خالی اور بیکار نہ جائے گی۔ ہر دعا

ذخیرہ کے طور پر رہے گی اور اپنے وقت پر کام دے گی۔ یہ وعدہ کہیں نہیں کہ فلاں فلاں دُعا کرنے والوں کی دعائیں انھیں کی مرضی و خواہش کے مطابق منظور ہی کر لی جائیں گی۔

اور یہ سب بھی اسی صورت میں ہے جب دُعا کرنے والے کی ذات میں قبولیت دُعا کی ساری شرائط جمع ہوں۔ جیسے التزام، اکلِ حلال وغیرہ باقی جب ان شرائط میں کوتاہی ہے تو عدم قبول دعا پر کوئی سوال کسی درجہ میں بھی نہیں پیدا ہوتا۔ محض اضطرار اور اضطراب کا قبول دُعا کے لیے کافی ہونا کہیں سے بھی منقول نہیں۔

بندہ بے چارہ صرف اپنی آرزو کو دیکھتا ہے۔ اس کی محدود نظر اس سے زیادہ دیکھنے کی اسے اجازت نہیں دیتی۔ اسے کیا خبر کہ تکوینیات میں ادنیٰ سے ادنیٰ جنبش کا بھی ربط و تعلق سارے نظامِ تکوینی سے ہوتا ہے۔ اتنی بے شمار چیزوں سے جن کا تصوّر بھی بندہ کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اور ہوتا وہی ہے جو سارے نظامِ عالم کے لیے قرینِ مصلحت ہوتا ہے۔

جس روز یہ حقیقت دل میں اتر جائے گی، دُعا کے عدم قبول پر شبہات اور سوالات از خود کافور ہو جائیں گے ——— مثنوی میں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت آدمؑ نے ایک بار سوال عرض کیا کہ ابلیس ہی کو توفیقِ ہدایت کیوں نہ ہو گئی۔ جواب میں ؎

بانگ بر زد غیرت حق کاے صفی ——— تو نہ می دانی ز اسرار خفی

"غیرتِ حق پکار اٹھی کہ اے بندۂ مقبول تجھے ہمارے اسرار اور مخفی حکمتوں کی کیا خبر؟"

تو اس حکیم مطلق کی بے شمار حکمتوں اور لاتعداد مصلحتوں کا (جن پر احاطہ کسی نبی مرسل و ملک مقرب کو بھی نہیں ہوسکتا) استحضار اگر رہے تو اس قسم کا کوئی سوال ہی دل میں نہ پیدا ہو۔ سارے سوالات اسی کے عدم استحضار سے پیدا ہوتے ہیں۔

(س) اور یہ موت اگر بچہ کی دادھیال میں ہوتی تو بہتر تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہم طبی امداد بروقت نہ پہنچا سکے اور ان کو بروقت اطلاع بھی نہیں دی ورنہ وہ معقول علاج کرتے۔ بلکہ ان کے ایک چچا ہم پر بُری طرح برس پڑے۔

(ج) وفور جذبات میں زیادہ غصہ آجانا بھی ایک حد تک قدرتی ہے اور تازہ حسرت کے وقت ایسے کلمات زبان پر آجانا بھی فطرتِ بشری سے کچھ زیادہ بعید نہیں۔

لیکن حقائق اُمور سے انھیں ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ کوئی شے ادنیٰ سے ادنیٰ بھی خلاف نوشتۂ تقدیر ہو کیونکر سکتی تھی۔ ہونے والی موت کا نہ وقت ٹل سکتا تھا نہ جگہ بدل سکتی تھی، نہ اسباب و حالات میں کوئی ادنیٰ تغیّر ممکن تھا۔

اگر آپ لوگوں سے دانستہ اور اپنے حد اختیار کے اندر غفلتیں، کوتاہیاں اور بے تدبیریاں ہوئی ہیں تو آپ لوگ دادھیال والوں سے

معذرت کر کے انھیں منالیں۔

لیکن اگر یہ صورت نہیں بلکہ آپ لوگ اپنی والی ہر بشری تدبیر وسعی کر چکے تھے تو اطمینان رکھیں کہ آپ کا پورا اجر ہو چکا، اور دوسرے فریق کی بے جا خفگیاں اسی اجر کو صرف بڑھانے والی ہیں۔

(س) رات اپنے معمول کے وقت سونے لیٹا۔ خوب ٹھنڈی ہوا خواب آور چل رہی تھی مگر بجائے نیند آنے کے معاً مرحومہ کی وہ صورت نظر کے سامنے آگئی جو قبر میں اتارتے وقت آخری بار دیکھی تھی، اور گویا وہ زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ خود تو آرام سے بستر اور پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہم کو تنہا سنسان قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے دبا آئے ہو۔

(ج) لیکن وہ مرحومہ منوں مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہیں ہی کہاں؟ یہ تو نرا وہم ہی وہم ہے۔ وہاں تو ان کا صرف جسد خاکی پڑا ہوا ہے۔ بے جان اور ہر طرح کے احساس وادراک سے معرّیٰ۔ اس جسم کی اہمیت تو صرف اس وقت تک تھی جب تک ایک زندہ روح اس کے اندر موجود تھی۔ اور روح کے کوچ کر جانے کے بعد تو وہ جسم خاکی ویسا ہی بے کار ہو گیا جیسے میلے کپڑے جسم سے اُتر جانے کے بعد ہو جاتے ہیں۔ لباس کی اہمیت تو صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ جسم پر رہے۔ اس کے بعد کپڑے جس حالت میں بھی پڑے رہیں، پہننے والے کے جسم پر اس کا کیا اثر۔ اور مرحومہ تو انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت جنت برزخی میں ہوں گی (جس کی توقع ہر مومنہ مسلمہ کے لیے رکھنا

چاہیئے) دُنیا کی ساری کلفتوں، زحمتوں، فکرمندیوں سے آزاد اور ہر بیماری سے بالاتر۔ بجائے گلہ وشکوہ کے وہ تو یہ کہہ رہی ہوں گی کہ الحمدللہ اب بڑے مزے میں ہوں۔ سفر کی ساری تکلیف دہ منزلیں ختم کر کے اب اطمینان سے اپنے وطن اور منزل مقصود کو پہنچ گئی ہوں۔ ایمان کا سرمایہ جیسا بھی کچھ تھا بہت کام آیا، اور اللہ ورسول کے کیے ہوئے جتنے بھی وعدے کان میں پڑے ہوئے تھے۔ ان سب الطاف وانعامات کا مشاہدہ ہوگیا۔ آپ کو اگر ان نوازشوں کی خبر ہوجائے جو ہر کلمہ گو پر آنکھیں بند ہوتے ہی نازل ہونے لگتی ہیں تو آپ تو اس گھڑی سے بچنے اور بھاگنے کے بجائے الٹی اس کی تمنا وآرزو کرنے لگیں۔

یہاں کی "خواب آور ٹھنڈی ہواؤں اور آرام دہ بستر" کا اس عالم کے عیش وراحت سے مقابلہ ہی کیا، اس جنتی لطف ومسرت کے سامنے تو یہاں کا بہترین شاہانہ عیش بھی کلفتوں ہی کا مجموعہ ہے۔

(س) مرحومہ کا پلنگ خالی دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہوگئی۔ ۴۲/۴۳ سال کا ساتھ چھوٹ جانا کچھ آسان نہیں۔ لیٹے سے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ بارہ بجے ایک بجا، اور میں ٹہلتا ہی رہا۔ آخر خستہ ہو کر پلنگ پر پڑ گیا اور سو گیا۔

(ج) اس اضطراب واضطرار کے عالم میں اگر قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی ہوتی یا کلمہ طیبہ کا یا دُرود شریف کا ورد، تو اپنی ہی تسکین قلب کہیں زیادہ اور بہت جلد ہوگئی ہوتی اور مرحومہ کی رُوح کو بھی مسرت کہیں زیادہ حاصل ہوتی۔

بہر حال طویل رفاقت کے بعد تو جانوروں تک سے انس پیدا ہو جاتا ہے اور طوطا، مینا، گھوڑا، گائے، بیل، بلی، کبوتر سب ہی کی مفارقت کا قلق دل کو محسوس ہونے لگتا ہے چہ جائیکہ اپنا عزیز اور عزیز بھی کون، اپنی بیوی، جس سے قریب تر کوئی اختیاری رشتہ اور ارادی تعلق تصور میں بھی نہیں آتا۔ اس شریکِ زندگی اور مایۂ تسکین کی لمبی رفاقت کے ختم (اور پھر دفعتہً ختم) ہو جانے پر طبعی غم و صدمہ جتنا بھی ہو بجا ہے ——— لیکن سفر زندگی کے ختم کی منزل تو ناگزیر ہے۔ اور یہ منزل زندگی سے بڑھ کر قطعی اور یقینی۔ موت کے فوری سبب کو تو چاہے حادثہ یا اتفاق کہہ لیا جائے۔ لیکن نفسِ واقعۂ موت تو کسی معنی میں بھی حادثہ نہیں۔ اور جس منزل سے گزرنا انبیاء تک کے لیے ناگزیر رکھا گیا ہے وہ کوئی لازمی مصیبت تو بہر حال نہیں ہو سکتی۔ وہ وہ تو محض ایک راستہ یا ایک پُل ہے۔ ایک مستقل و برتر زندگی کے لئے۔ موت کے وقت توشۂ ایمان اگر درجۂ ادنا میں بھی ساتھ ہو تو انشاء اللہ اس عالم بقا کے لیے کافی ہو جائے گا۔ چہ جائیکہ جب وہ توشہ کسی اعلیٰ درجہ میں ہو۔

رحمت کے اس عام و مستقل قاعدہ کے علاوہ، جو ہر مومن و مومنہ کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے، اللہ کی رحمت و مغفرت نے اپنے لیے جو "چور دروازے" بیسیوں بلکہ پچاسوں کھول رکھے ہیں، ان کا کوئی حساب ہی نہیں۔ مثلاً سال کے فلاں فلاں دنوں میں، فلاں فلاں تاریخوں میں فلاں فلاں عشرہ میں، فلاں فلاں مہینہ میں وفات۔ فلاں فلاں امراض میں

وفات، فلاں فلاں حالات میں وفات وغیرہا۔ ان مرحومہ میں تو ان اختیاری وغیر اختیاری اسباب میں سے ایک نہیں متعدد جمع ہو گئے تھے، اس لیے ان کی خوش انجامی اور خوش عیشی میں خواہ مخواہ شک و شبہ ہی کیوں کیا جائے۔ انشاءاللہ یہاں سے کہیں بہتر حالت میں وہاں ہوں گی۔

۲۵

وَلوُلہ کی کمی

(س) آج کل معمولات ناغہ ہونے سے دل میں پہلے کی مانند افسوس و رنج نہیں پیدا ہوتا۔ پہلے بزرگوں کی ہدایات کے لیے دل بے قرار رہتا تھا اب وہ احساس بھی نہیں ہے۔ اس لیے متفکر ہوں کہ آیا یہ حالت مذموم تو نہیں۔

(ج) قلب کی یہ کیفیات نہ ہمیشہ یکساں رہ سکتی ہیں اور نہ اپنے اختیار کی ہیں۔ اس لیے ان پر مواخذہ بھی نہیں۔

(س) بحمد اللہ معمولات تو ادا ہوتے ہیں۔

(ج) بڑی نعمت ہے۔

(س) لیکن پہلے کی مانند ولولہ اور جوش و خروش نہیں۔ اور رقت کسی وقت بھی نہیں پیدا ہوتی۔

(ج) ولولہ اور رقتِ قلب دونوں غیر اختیاری ہیں۔ اس لیے مواخذہ سے دونوں بری۔

(س) آجکل اکسیر ہدایت کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہوں۔

(ج) کام کی چیز ہے۔

(س) دُعا کرتے کرتے توجہ اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے۔

(ج) یکسوئی بھی غیر اختیاری ہے۔ البتہ ارادی اسباب غفلت و انتشارِ قلب سے بچا جائے۔

(س) انکساری و عجز اب تک نہیں پیدا ہوا۔

(ج) عمل میں تواضع برتنا فعلِ اختیاری ہے، اس کی کوشش پیہم رہے اور اسباب ترفع سے اجتناب۔ باقی قلب میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا غیر اختیاری ہے اور اس لیے بندہ اس کا مکلف بھی نہیں۔

(س) پرسوں رات یکایک حضرت بہلولؒ کا خیال و تصوّر پیدا ہوا، نہ معلوم کیوں بار بار حضرت بہلول کا تصوّر پیدا ہوتا رہا۔

(ج) کسی خاص تاریخ میں ان کا مستند حال تو نظر سے گزرا نہیں۔ عام روایتوں سے جہاں تک پتہ چلتا ہے یہ ایک اچھے آدمی اور برگزیدہ بندہ تھے اور اچھوں کا تصوّر بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔

(س) ابھی ابھی اپنا ایک مرض تشخیص ہوا، وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں امید ہے کہ علاج فرمائیں گے۔ میرے دل کے اندر ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مجھے کوئی بُرا نہ کہے بلکہ ہر کوئی مجھے اچھا کہے۔ ہر دینی یا دنیوی کام میں بھی یہی خواہش رہتی ہے۔ مدّت کے بعد آج یکایک اس پر آگاہ ہو گیا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مرحمت فرما دیا کہ مدّت کے بعد اس سے آگاہ کر دیا۔

(ج) یہ تو ایک جذبۂ طبعی ہے اگر اپنے حدود کے اندر ہے۔ حد سے متجاوز ہونے میں البتہ طرح طرح کی خرابیاں ہیں۔ علاج اپنی خامیوں، لغزشوں

کوتاہیوں کا اجمالی نہیں تفصیلی استحضار ہے۔ اور یہ مراقبہ، یہ کوتاہیاں تو خود قابلِ ملامت ہیں۔

خود اس استحضار میں معین یہ دو طریقہ ہیں ایک اچھی اور ایسی عیوب کشا کتابوں کا مطالعہ۔ مثلاً تصانیف غزالیؒ، مواعظ و ملفوظات تھانویؒ۔ دوسرے حق گو و متوازن الاخلاق لوگوں کی صحبت۔

(س) مثلاً کوئی کام مجھے بُرا معلوم ہوتا ہے مگر بُرا کہنے سے احتیاط رکھتا ہوں کہ شاید وہ مجھے بُرا کہیں۔

(ج) حق گوئی کے فضائل، امر بالمعروف کی تاکید، صدق بیانی کے احکام، حدیث و فقہ و اخلاق کی کتابوں سے برابر نظر میں رہیں۔

(س) دواؤں کا بل قرض کیجئے دس روپیہ ہوگیا ہے مگر روپیہ طلب کرنے سے دل ہچکچاتا ہے کہ وہ لوگ مجھے بُرا سمجھیں گے۔

(سائل ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں)

(ج) اس کا نام افراط مروّت ہے۔ اس کے مادی و مالی نقصانات تفصیل کے ساتھ اور ایک مدّت تک برابر نظر کے سامنے لائے جاتے رہیں۔

(س) اب محسوس ہوتا ہے کہ معاشی تنگی اسی لیے اس حد کو پہنچی کہ میرے اندر یہ خبیث مرض جڑ پکڑے ہوئے ہے۔

(ج) اس معاشی تنگ دستی کا تعلق کسی رُوحانی مرض سے اتنا نہیں، جتنا دنیوی بے تدبیری سے ہے اور بے جا مروّت بھی اسی میں داخل ہے۔

(س) باوجود اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کے معاشی حالت روز بروز

خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور گھر میں صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔

(ج) دُعا کے ساتھ ساتھ اس عالمِ اسباب میں اسباب کی پوری پوری رعایت بھی خالقِ کائنات ہی کے احکام کی اطاعت ہے۔

(۲۶)

مناجاتِ مقبول کی دُعائیں

(س) دین کا قائل تو اللہ کے فضل و کرم سے پہلے ہی سے تھا لیکن اس کی اہمیت اور جامعیت کا ادراک کچھ کچھ اب ہو رہا ہے۔

(ج) بارک اللہ و ماشاء اللہ۔ بڑی نعمت ہے۔ ہر طرح قدر کے قابل۔

(س) مناجاتِ مقبول کی دُعاؤں اور ان پر آپ کے حاشیے دُعا کے طور پر تو کم ہی (یہ یوں کہ پڑھتے وقت دل پر وہ کیفیت اور وہ تاثر نہیں پیدا ہوتا جو ہونا چاہیے۔)

(ج) مضائقہ نہیں۔ گو اپنی والی کوشش اس کی بھی کرتے رہنا چاہیے۔

(س) لیکن مطالعہ کے طور پر پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

(ج) عجب بات ہے کہ خود اس مناجات کے بدنصیب شارح کا بھی یہی حال ہے۔ لذت صرف ایک علمی بیان کی حد تک۔ اور روحانی حظ و حلاوت سے محرومی۔

(س) اور یہ حقیقت ہے کہ ایمان کی اصلاح جیسی ان دُعاؤں اور ان کی تشریحات

کے پڑھنے سے ہوئی ہے، ایسی موٹی اور ضخیم کتابوں کے پڑھنے سے بھی نہیں ہوئی تھی۔

(ج) الحمد للہ۔ یہ بھی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

(س) اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کی سچی طلب اور لگن بھی دل میں پیدا کر دے۔ حضور والا سے بھی التجا ہے کہ اس ناکام و نامراد کے حق میں بھی اس کے لیے دعا فرماتے رہیں۔

(ج) آمین! کاتب و مکتوب الیہ دونوں کے حق میں۔

(س) علی گڑھ کے ساتھیوں میں ایک صاحب جن کی فہم و فراست اور اس سے زیادہ ان کی شرافت نفسی کا بھی قائل تھا، اب سُنا ہے کہ کمیونزم کی بلا میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس کا خدا معلوم کیوں مجھے بے حد صدمہ ہے۔

(ج) صحبت و ہوا خواہی کی بنا پر صدمہ بالکل طبعی ہے۔

(س) میرا ذاتی خیال ہے کہ طلباء کے حق میں بعض تو کمیونسٹ یوں ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی اخلاقی بے راہ روی اور پشت پناہی یہاں حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بعض مساوات، امن، آزادی، انسان دوستی وغیرہ کے پروپیگنڈے اور نعروں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

(ج) تشخیص بالکل صحیح ہے۔

(س) جو مخلصانہ طور پر انسان دوستی کے جذبہ کے ماتحت اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کرتے ہیں ان پر رحم آتا ہے۔

(ج) بیشک مستحق رحم ہیں۔

س) میں سوچتا ہوں کہ اسلام نے فرد اور جماعت کی بلندی اور برتری کا جو معیار پیش کیا ہے، اور اس معیار تک پہنچنے کے لیے جو نظام اخلاق پیش کیا ہے اگر اس کو جاننے اور اس پر غور و فکر کرنے کی زحمت ہمارے مسلمان ساتھی گوارا کرتے تو کوئی آئیڈیالوجی سوائے اسلام کے ان کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی تھی۔ اگر وہ واقعی انسانیت کے خواہاں اور امن و مساوات کے متمنی ہیں۔

ج) عین حقیقت یہی ہے۔

س) ایک دقّت یہ بھی تو ہے کہ اسلام کو اس کے کل (Whole) میں ہم دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اگر دیکھتے بھی ہیں تو صرف جزء میں۔

ج) بالکل صحیح ہے۔

س) صرف اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ کمیونزم اسلامی نظامِ حیات کا محض ایک جزء ہے۔

ج) صحیح ہے، مگر اس قید کے ساتھ کہ کمیونزم سے مُراد صرف ایک معاشی نظام لی جائے۔ اس کمیونزم کو ترمیمات کے بعد اسلام کے نظامِ حیات کے اندر کھپایا جاسکتا ہے اور اس کا ایک جزء بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے کمیونزم کو بجائے خود ایک مستقل نظامِ حیات اسلام کے مقابلہ پر ٹھہرالیا ہے اور معاد وغیرہ عقائد میں بھی اسے خود مکتفی سمجھ رکھا ہے ان کے کمیونزم کی اسلام کے اندر کوئی گنجائش نہیں۔

س) میرے ذہن میں مطالعہ کی ایک اسکیم ہے جسے جناب والا کی خدمت میں منظوری کے لیے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(ج) جزاک اللہ! بڑا مبارک و کارآمد خیال ہے۔

(س) (۱) کمیونزم کے بنیادی اصول و عقائد کیا ہیں اور کن حالات و واقعات میں انھیں مدون و مرتب کیا گیا؟

(۲) یہ اصول و عقائد انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو کس منزل تک پہونچاتے ہیں؟

(۳) سوویت یونین نے اس "منزل" تک پہونچنے کے لیے کیا راہِ عمل متعین کی ہے؟

(۴) فکری اور نظری حیثیت سے جس منزل کا سراغ لگایا تھا کیا وہ اس منزل تک پہونچ بھی سکے؟

(۵) کمیونزم نے انسانی زندگی کو (انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے) جہاں آج پہونچایا ہے وہاں زندگی اور انسانیت کا کیا حال ہے؟

پھر انھیں عنوانات کے ماتحت اسلام کا مطالعہ کیا جائے۔ اسلامی حکومت بھی دُنیا کے بڑے حصے پر رہی ہے اور کافی عرصہ تک رہی ہے۔ اسلام کو انفرادی اور اجتماعی طور پر برتا بھی گیا ہے۔ ایک سوسائٹی اسلامی اصول و عقائد کی بنیاد پر وجود میں آئی بھی تھی۔ دیکھا جائے کہ زندگی کا یہاں کیا حال تھا۔ انسانیت کس منزل میں تھی۔

مقصد اس مطالعہ کا یہ ہے کہ سنجیدہ طور پر نعروں اور پروپگنڈے سے ہٹ کر اسلام کی جامعیت اور کاملیت کو دیکھا جائے اور دوسروں کو دکھایا جائے۔ لیکن آپ کی مرضی اور مشورہ کے بغیر اس راہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا۔

(ج) ماشاءاللہ وجزاک اللہ! یہ ہر طرح بڑا مبارک ومستحسن اقدام ہوگا۔ سوویت روس کا کمیونزم کی نمائندہ حکومت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اسلام کی نمائندگی کے لیے صرف انھیں حکومتوں اور حاکموں کو لیا جائے جن کی اسلامیت واضح ومسلم ہو۔ یعنی دورِ رسالت وخلافت راشدہ کے بعد اور اس سے اتر کر صرف خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضؓ، ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی نیز ناصر الدین محمود دہلوی وغیرہم کو۔

(س) ہمیشہ سے یہ حالت رہی ہے کہ کسی بھی امر کے لیے جب دل میں سچی تمنا کرتا ہوں تو اس کے پورا ہونے کے فوراً اسباب اللہ تعالیٰ بنا دیتا ہے اور وہ خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ شرعاً جائز ہو یا ناجائز۔

(ج) ایک حد تک تو حق تعالیٰ کا یہ معاملہ سارے ہی بندوں کے ساتھ رہتا ہے وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل)

یعنی صاحبِ ایمان بندہ جب آخرت کو مقصود بنا کر اس کے لیے کوشش کرتا ہے تو ایسوں کی کوشش ضرور کامیاب بنا دی جاتی ہے اور اسکے مقابل مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ۝ یعنی جو دُنیا کی طلب میں رہتے ہیں انھیں جن کے متعلق مشیتِ الٰہی ہوتی ہے دُنیا بھی مل جاتی ہے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ غرض دادِ الٰہی کسی پر بند نہیں،

سب ہی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ بعض بندوں کو اس عموم میں کوئی مرتبہ خصوص حاصل ہو، تو جائز خواہشوں کے پورے ہوجانے کو تو تمامتر ایک عطیۂ غیبی سمجھنا چاہیے اور ہرگز یہ شبہ دل میں نہ لانا چاہیے کہ ان نعمتوں کے عوض آخرت کی نعمتیں کٹ جائیں گی۔ نعوذ باللہ کیا اللہ کے یہاں بھی کسی بخل یا خست کی گنجائش ہے؟ —— البتہ ناجائز تمناؤں کا فوراً بر آنا، یہ بیشک فکر و اندیشہ کی بات ہے، اور اس سے ہمیشہ پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔

(س) اس لیے بار بار دل میں سوچتا ہوں اور کبھی اندیشہ بھی کرتا ہوں کہ خدانخواستہ کہیں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں مجھ پر دُنیا ہی میں تو پوری نہیں کر رہا ہے اور آخرت میں کچھ نہ رہے۔ اس خیال سے پریشان رہتا ہوں۔

(ج) جواب اُوپر آ چکا ہے۔

اُدھر سے جو کچھ بھی معاملہ ہو اس کی ذمہ داری بندہ پر مطلق نہیں بندہ کو فکر تو اپنی اختیاری چیزوں کی رکھنا چاہیے ...... سو جو امور ناجائز ہیں ان کی تمنا ہی (چہ جائیکہ ان کی سعی) میں کیوں لگا جائے، روک تھام کی اصل شئے تو یہ ہے۔

(س) ہر وقت دل پر کسی نہ کسی سبب سے بے اطمینانی اور رنج رہتا ہے۔ کبھی دنیوی معاملات سے مطمئن ہوتا ہوں تو صحت کی خرابی سے دل پریشان رہتا ہے۔ کبھی صحت اچھی ہے تو کسی اور معاملہ کی طرف سے رنج درپیش ہے۔ غرض یہ کہ کسی نہ کسی وجہ سے دل پر بے اطمینانی اور فکر

رہتی ہے۔

(ج) ایسا کون بشر ہوا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے تکوینی حالات تمام تر اس کی مرضی کے تابع ہوں۔ خلافِ طبع، خلافِ مزاج، خلافِ مرضی حالات تو زاہد و فاسق سب ہی کو پیش آتے رہنے لازمی ہیں۔ بندہ کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے کو ان سے بہت زیادہ متاثر نہ ہونے دے۔ اس کا استحضار اگر برابر رہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے ایک رحیم و شفیق اور حکیمِ کل آقا ہی کی طرف سے پیش آتا ہے، تو طبعی ناگواری بہت گھٹ کر حدِ اعتدال کے اندر آجائے گی اور یہ استحضار کیونکر حاصل ہو، یہ ایک عرصہ تک مسلسل مشق و مزاولت اور اسی عقیدہ کے مراقبہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔

(۲۷)

اصلاحِ باطن کی تڑپ

(س) بندہ امسال دورۂ حدیث کا طالب علم ہے۔ چند ماہ بعد رسماً سندِ فراغ مل جائے گی۔ لیکن واقعۃً میں اس کا مستحق نہیں۔ پورا پورا دن قال قال رسول اللہ صلعم زبان سے کہتے کانوں سے سُنتے اور آنکھوں سے دیکھتے گزرتا ہے لیکن اعمال کا جب جائزہ لیتا ہوں تو اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے۔

(ج) اپنے حال پر تاسف ایک مبارک علامت ہے۔

(س) سنتا ہوں کہ دورۂ حدیث میں طالب علم کو حضور صلعم کی زیارت بار بار نصیب ہوتی ہے۔

(ج) جس کسی نے یہ روایت بطورِ کلیہ بیان کی ہے اس نے بہت مبالغہ سے کام لیا۔ اس کا اگر لزوم ہوتا تو پہلے ہر حافظِ قرآن اس دولت سے بہرہ مند ہوتا ـــــــ "ہونی چاہیے" اور "ہوتی ہے" کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

(س) بصد التجا گزارش ہے کہ اوقاتِ مخصوصہ میں دُعا میں ضرور یاد رکھیں۔

(ج) اس دولت کے حصول کی تمنّا ضرور ہر مؤمن کے قلب میں ہونا چاہیے لیکن بہر حال اس کا درجہ بس ایک کیفیت ہی کا ہے۔ اس لیے اس نتیجہ غیر اختیاری کے عدمِ حصول پر زیادہ ملول ہونا صحیح نہیں۔

(س) خدا کے فضل وکرم سے باطنی اصلاح کے جذبات ترقی پر ہیں (اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ) بار بار آپ کو لکھوں۔ ادب واحترام کے جذبات اجازت نہیں دیتے۔ میری باطنی اصلاح علیٰ سبیل التکمیل اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد آپ ہی کے ذریعہ ہوگی۔

(ج) بالکل اُلٹی بات لکھی۔ ادھر خود اپنی نجات کی جو کچھ امید ہے اس کا ایک سہارا آپ ہی کے سے حُسنِ ظن رکھنے والوں کی دُعائیں ہیں، اور دعا گوئی تو ہر مسلمان کا حق دوسرے مسلمان پر ہے۔

(س) ادھر سال چھ مہینے میں تصنیفیں زیادہ تر جناب والا کی اور حضرت گیلانیؒ کی نظر سے گزریں، جس کا اثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ احساسِ عبدیت میں کچھ نہ کچھ صفائی ضرور پیدا ہوئی ہے۔

(ج) الحمد للہ وبارک اللہ! احساسِ عبدیت ہی تو اصل شے ہے۔

(س) الفرقان کے افاداتِ گیلانی نمبر میں حضرتؒ کا مقالہ "دجالی فتنہ اور سورہ کہف" بہت پسند آیا، اور دل پر اثر انداز بھی ہوا۔ حضرت گیلانیؒ سے ایک عجیب عقیدت دل میں محسوس کرتا ہوں۔

(ج) بیشک وہ تھے ہی ایسے۔

(س) ایک خیالی پیکرِ حضرت کا ذہن میں بنتا رہتا ہے۔ بارہا یہ خواہش ہوتی ہے

کہ خواب ہی میں حضرتؐ کا دیدار نصیب ہو جاتا۔ ایک فاسق و فاجر کی ایسی آرزو۔ !

(ج) اصل شئے دل کا تعلق و ربط ہے۔ خواب اس کے مقابلہ میں بہت ہلکی چیز ہے۔

(س) شخصیات سے ذہن و دماغ کو متاثر شاید اعتدال سے کچھ زیادہ ہی پاتا ہوں۔ اپنے نزدیک جو شخصیتیں برتر و بزرگ معلوم ہوتی ہیں ان کے خیال میں اکثر و بیشتر ڈوبا رہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں ایمان کے لیے کوئی خرابی مضمر نہ ہو۔

(ج) اللہ کی محبّت تو عقلی ہے اس کو ہر دوسری عقلی محبت پر غالب رہنا چاہیئے اور انشاء اللہ ایسی ہو گی بھی۔ بزرگوں سے تعلق عموماً محبت طبعی کے ماتحت ہو جاتا ہے جو کسی بھی محبّتِ عقلی کے منافی نہیں۔ ہاں اگر محبّت عقلی بھی کسی مخلوق کی ایسی ہی پیدا ہو جائے تو وہ بیشک خطرناک ہے بگر آنعزیز جیسے صاحبِ فہم کے لیے اس کا اندیشہ ہی کیوں کیا جائے۔

(س) اللہ اور رسُولؐ کی محبّت و عظمت کو سب پر غالب کرنے کا کوئی آسان وظیفہ تجویز فرمائیں۔

(ج) اتباعِ احکام سے آسان تر کوئی نسخہ نہیں۔ جس اخلاص سے اتباع جاری رہے گا اسی نسبت سے قلب میں انشاء اللہ محبت و عظمت دونوں بڑھتی جائیں گی۔ کلمۂ طیبہ کے علاوہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم کی تکرار بھی دن رات میں جتنی بار ہو سکے مفید ہو گی۔

(س) کچھ سال قبل طبعی رُجحان میں سختی اور شرارت رہی۔ سینما بینی کا شوق انتہائی عُروج پر تھا۔ سینما کی برکت سے زبان پر ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تعریفیں، مسخرہ پن، لایعنی باتوں کی مشغولیت کے سوا، جہاں کہیں بھی اللہ و رسُول کا ذکر ہوتا تھا وہاں ٹھہرنے کا بھی جی نہیں چاہتا تھا اسی دوران میں حضرت تھانوی کے ایک معتقد ہم عمر نوجوان کی معیت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ جس کے پاس حکیم الامت کے مواعظ و تصانیف اور "سچ" و "صدق" کے قدیم و جدید پرچے بھی کافی تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندگی کا دوسرا باب شروع ہونے والا تھا۔ مندرجہ بالا کتابوں اور پرچوں کے مطالعہ کا کافی شوق شروع ہوا۔ کچھ ہی عرصہ گزرنے پر خود میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ سینما سے نفرت، فضول گوئی سے احتیاط۔ اتنے دنوں کی سیہ کاری پر ندامت کے ساتھ بزرگان دین کی صحبتِ فیض کا شوق بھی تڑپانے لگا۔

(ج) فالحمدللہ و بارک اللہ!

(س) پھر بھی ہر روز خود میں کئی لغزشیں اور نقائص کے سرزد ہوتے رہنے سے قلق ہوتا ہے۔

(ج) یہ مشاہدہ نقص نہ ہوتا رہتا تو خود ایک بڑا نقص مشاہدہ رہ جاتا۔ مسلسل سعیِ اصلاح تو لازمی ہے۔

(س) دُعائے خیر فرمائیں۔

(ج) دعائے خیر تو انشاءاللہ بہرحال ہوگی۔ اصل توجہ خود اپنے کرتے رہنے کی ہے۔

(س) کاروباری معاملات میں ملازمین سے برتاؤ جب تک سختی سے رہا انتظام درست رہا۔ لیکن آج کل طبعی رجحان سختی پہ نفرت اور نرمی پر مائل رہتا ہے۔ نرمی کو اختیار کیا تو انتظام میں بگاڑ ہونے لگا ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

(ج) بیشک اکثر طبیعتوں میں چونکہ صلاحیت خود باقی نہیں رہتی ہے اس لیے ایسے واقعات بیشتر پیش آتے ہیں ـــ بجز صبر اور حالات کے پیش نظر بہتر انتظام کے اور کوئی صورت نہیں۔

(س) میرے ایک کرم فرما مولوی ...... صاحب کی اہلیہ کا حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ بڑی خوبیوں کی مالک تھیں، بڑی فیاض اور مخیر، مذہبی رنگ بہت گہرا تھا۔ مولوی صاحب موصوف پر ان کے انتقال کا بے حد اثر ہے۔ تسکین کسی طرح نہیں پا رہے ہیں۔ ماشاءاللہ خود بھی بڑے گہرے مذہبی ہیں اور فراغت بھی دیوبند سے حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اتنی وسعتِ معلومات اور بڑے چھوٹے عالموں سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ خلش انھیں سکون نہیں لینے دیتی کہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لیے داد و دہش یا تلاوت قرآن اور دعائیں جو کی جارہی ہیں آیا اس کا احساس مرحومہ کی روح کو بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔

(ج) اللہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور درجاتِ عالیہ نصیب کرے۔ جس باب میں ان کے شوہر کو الجھن ہو رہی ہے وہ بات تو بالکل صاف ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شدتِ تاثر سے ذہن اپنی عام

قوت، فہم، فراست سے ذرا ہٹ گیا ہے۔ اللہ جلد ان کی طبیعت کو ہر طرح بحال کر دے۔

مغفوریت کی اُمّید تو ہر مومن اور ہر مومنہ سے متعلق قدرتی طور پر رکھنا ہی چاہیئے۔ اس کے خلاف کے لئے البتہ کسی دلیلِ قوی کی ضرورت ہے۔ نارمل طور پر ہر مسلمان کو مغفور سمجھنا ہی چاہیے۔ اور یہ جو آیا ہے کہ ایمان درمیان میں ہے خوف و رجا کے۔ تو یہاں بھی غالب پہلو رجا (امید) ہی کا رہنا چاہیے۔

برزخ میں رُوح کی ذکاوتِ حس تو اس عالم ناسوت سے بدرجہا بڑھ جاتی ہے اور یہاں جسمانیت کے باعث جو قیود حائل رہتی ہیں وہ از خود دُور ہو جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس عالم کی سیر میں پڑ کر رُوح کو اس عالم عنصری کی جانب التفات ہی نہ رہ جائے لیکن رُوح اگر مغفور و مرحوم ہے تو یہاں کی ہر خوشی اور ہر خوش گوار چیز کو فرشتوں کے ذریعہ ادھر منتقل ہوتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔ اور یہ حق تعالیٰ کے ساتھ سُوءِ ظن ہے کہ یہاں کے مومنین اپنے کسی عزیز کی روح کو تحفوں سے شاد کام کرنا چاہیں اور اس کے لیے التجا کریں اور ادھر خود وہ رُوح بھی مغفور ہو، اور پھر بھی وہ تحفے اس تک پہونچنے سے روک لیے جائیں! یہ رحمت الٰہی سے بہت ہی مستبعد ہے۔

(۲۸)

اصلاح اعمال واخلاق

(س) حضورِ والا کے کرم اور التفات نے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی اطاعت کی طرف دل کچھ مائل معلوم ہوتا ہے کلام پاک کی تلاوت کرتا ہوں، اور جو آیتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں انھیں حفظ کر لینے کا شوق ہوتا ہے۔

(ج) الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔ باقی اس میں دخل ایک تباہ کار کے کرم و التفات کو مطلق نہیں۔ جو کچھ بھی حاصل ہوا، اللہ کے فضل وکرم کے بعد اپنے ہی اخلاص وسعی طلب کا ثمرہ ہے۔

(س) اصلاح اعمال واخلاق کے لیے جناب والا نے بارہا تین باتوں پر زور دیا ہے:

(۱) اچھے اور باخدا بزرگوں کی صحبت

(۲) اچھی کتابوں کا مطالعہ

(۳) آخرت فراموش ماحول سے گریز

پہلی اور آخری باتوں سے تو بالکل محروم ہوں۔ کتابوں کا مطالعہ البتہ کرتا ہوں

پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں مندرجہ ذیل کتابیں شوق سے پڑھی ہیں ....

(ج) بندہ کے ذمہ صرف کوشش ہے۔ سارا اجر اسی اچھی کوشش پر ہے۔ نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ بندہ پر اس کی ذمہ داری ذرا بھی نہیں۔ صحبتِ صالحین کی تلاش اور غیر صالح ماحول سے بچنے کی کوشش اپنی والی برابر جاری رہے۔ بس اسی قدر کافی ہے۔

لیکن یہ بات کبھی نہیں کہ صحبتِ صالحین سرے سے عنقا ہو۔ اسی یونیورسٹی کے رقبے میں ہزارہا مسلمان آباد ہیں۔ کیا ان میں سَو پچاس یا دس بیس صالح بھی موجود نہیں؟

ہاں یہ خوب یاد رہے کہ مومن صالح سے مُراد معصوم نہیں۔ بشر بہر حال بشر ہی رہتا ہے۔ اور یہ بھی خیال میں رہے کہ ہر مردِ صالح جنیدِ وقت بھی نہیں ہوتا ـــــ تلاش سے طلبار کے طبقہ میں بھی بہت سے اپنے ہم مسلک ہم مذاق نکل آئیں گے۔

(س) افسوس ہے کہ دلجمعی اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ دن طبیعت بحال رہتی ہے تو کچھ دن انتشار و پراگندگی میں مبتلا رہتی ہے۔

(ج) اس اُلٹ پھیر سے تو بڑے بڑوں کو بھی نجات نصیب نہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام بسط و قبض ہے ـــــ نظر صرف اپنے آپ پر رکھنا ہے اور انھیں ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

(س) غم اور نامرادی کے احساس سے اکثر قلب گراں بار معلوم ہوتا ہے اور ایسی حالت بہت بُری ہوتی ہے جس میں کچھ کرتے نہیں بنتا۔

(ج) نشاطِ طبع کے بغیر اور حالتِ انقباض و افسردگی میں اپنے کام میں لگے

رہنا اجر مجاہدہ کا اضافہ کرنا ہے، جیسے سردی کے وقت رات میں یا فجر میں وضو کرنا۔

(س) ایک بات بطور سوال عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ـــــ باریِ تعالیٰ کا تصوّر انسانی فطرت کے بارہ میں کیا ہے؟ جبکہ اچھے اور بُرے اعمال کی جزا و سزا کے بارہ میں کلامِ پاک میں بہت ہی زوردار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

(ج) باری تعالیٰ کا تصوّر فلاں چیز کے متعلق کیا ہے۔ یہ جزم کے ساتھ کون بتا سکتا ہے۔ تاہم اتنا تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ اللہ نے کسبِ شر و خیر کی حد تک بندہ کو مجبور نہیں مختار اور اس کے لیے پورا ذمہ دار ہی قرار دیا ہے۔

(س) حدیث میں آتا ہے کہ فلاں دُعا پڑھو تو سانپ نہ کاٹے گا اور یا کوئی تکلیف نہ ہوگی، کچھ ضرر نہ ہوگا۔ لیکن جب تک وہ دُعائیں پڑھی جاتی ہیں کچھ نہیں ہوتا اور جب بُھول جائے تو تکلیف ہو جاتی ہے۔ تو جب تکلیف پہنچنا ہوتی ہے تو یا تو دُعا بھول جاتی ہے یا بُھلا دیا جاتا ہے۔ پھر جو تکلیف منظور ہوتی ہے پہنچ جاتی ہے۔ تو اب دُعا کو یہ کس طرح جانا جائے کہ اس کے پڑھنے سے ضرر نہ ہوگا۔ نعوذ باللہ بے اعتباری نہیں بلکہ ایک شبہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

(ج) سوال کی عبارت اُلجھی ہوئی ہے اور کئی باتیں صاف ہونے کی ہیں۔ اوّل تو بیشتر حدیثی دعاؤں کا وہ پایۂ استناد نہیں جو دوسری حدیثوں (مثلاً احادیثِ احکام) کا ہے۔ پھر جو دُعائیں ثابت ہیں ان میں بھی

صرف عام خاصیت ان دُعاؤں کی بتائی گئی ہے، کوئی وعدۂ قطعی کی صُورت نہیں ہے۔ اور سوال کا اصل رُخ تو مسئلہ تقدیر کی طرف ہے۔ دُعا بھی منجملہ اور تدبیروں کے ایک تدبیر ہے۔ وہ تدبیر مقدس اور مُؤثر سہی لیکن ہے بہرحال تدبیر۔ جس طرح تقدیرِ الٰہی ہر بشری تدبیر پر غالب آکر رہتی ہے اسی طرح تدبیرِ دُعا پر بھی۔ خواہ جن صورتوں سے بھی ہو۔

سوال کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ تقدیر کو کس طرح غیر موثر بنایا جا سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کسی طریقہ سے بھی نہیں۔

(س) کلام مجید میں آیا ہے:۔ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى الخ الآیۃ۔

شرط یہ ہے کہ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ہوتا ہے لیکن بالکل غیب کی نفی نہیں ہے۔ کچھ ثبوت معلوم ہوتا ہے۔

(ج) یہ سوال بھی اچھا خاصا اُلجھا ہوا ہے۔ پہلے ان کا تفسیری ترجمہ سُن لیا جائے:

"آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبرؐ) کہ مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (یعنی یومِ حشر اور عذابِ آخرت) وہ آیا قریب آگئی ہے یا اس کے لیے میرے پروردگار نے کوئی مدّتِ دراز رکھی ہے، وہی غیب کا جاننے والا ہے (غیب دانی اسی کی صفتِ خاصہ ہے) سو

(ایسے) غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا (چنانچہ مجھے بھی مطلع نہیں کیا) ہاں البتہ کسی برگزیدہ پیمبر کو (جب کسی غیبی علم سے مطلع کرنا چاہتا ہے) تو اس کے آگے اور پیچھے نگہبان بھیج دیتا ہے (کہ اس میں کوئی ادنیٰ دخل و تصرّف بھی خارج سے نہ ہو سکے) تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ انھوں نے اپنے پروردگار کے پیامات پہنچا دیئے۔"

سیاق سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں غیب سے مُراد اسرارِ شرعی ہیں جو فرشتوں کی حفاظت میں پیمبر تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر اسرارِ تکوینی مُراد ہوتے تو ان کے لیے تو مشاہدہ ہے کہ وہ اہلِ اشراق کو اور اہلِ نجوم کو، قدیم کہانت والوں کو اور جدید ہپناٹزم اور اسٹرلوجی/ پامسٹری والوں کو بھی ان کی مشق و ریاضت کی بنا پر کچھ نہ کچھ منکشف ہوتے ہی رہتے ہیں ـــــــ اس پر کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

(س) ایک سوال عرصے سے زیرِ گفتگو ہے وہ یہ کہ وہ گناہ کبیرہ جو عقلاً انسانیت کے لیے بھی انتہائی پُرظلم و اخلاق سوز و غضب اندوز ہو کہ جس کے تصوّر ہی سے خود مرتکب اپنے دل میں خجل و خائف ہو جائے۔ اللہ سے ایسے گناہ کے عفو کے لیے کیا صُورت اختیار کی جائے۔

(ج) کوتاہیاں اگر محض حقوق اللہ میں ہوئی ہیں تو ان کا علاج نسبتاً سہل ہے یعنی دل سے استغفار اور تلافی مافات مثلاً اگر نمازیں یا روزے چھُوٹ گئے ہوں تو انھیں قضا کی نیت سے اب ادا کر لینا۔

باقی اگر بندوں کی حق تلفی ہوئی ہے تو استغفار کے ساتھ بلکہ اس پر بھی مقدم اس کا عملی تدارک ہے۔ مثلاً اگر کسی کا مال ناجائز طریقہ سے حاصل کرلیا ہے تو اس کا مال اس کو واپس کرنا۔ یا اس سے معافی مانگ کر اس کو رضامند کرلینا۔ اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو یہی معاملہ اس کے وارثوں سے کرنا۔

اگر جسمانی آزار پہنچایا ہو تو مضروب یا مظلوم کو مال دے کر یا معافی مانگ کر بہر صورت اپنے سے رضامند کیا جائے۔

اگر معاملہ زناکاری کے قبیل سے ہے تو علاوہ دل سے توبہ و استغفار کے جس کی عصمت برباد کی ہے اس کے سامنے بھی اپنے قصور کا پوری طرح اعتراف کرنا اور ہر طرح اظہار تذلل کرنا ہے۔

غرض یہ کہ جہاں تک بندوں کے قصور کا تعلق ہے تلافی و تدارک کی ہر ممکن عملی صورت کو اختیار کرنا اور اپنے امکان بھر فریق ثانی کے لوحِ قلب سے اس نقش کو تمامتر مٹانا ہے ــــ بندہ کے ہاتھ میں بجز کوشش کے اور کیا ہے۔ اپنی والی پوری کوشش کر ڈالنا ہے۔ اپنے گناہوں، کوتاہیوں، لغزشوں کو مستحضر رکھنا خود ہی پہلا قدم اصلاح عمل کی طرف اٹھانا ہے۔ البتہ اس میں بھی غلو سے کام نہ لے ورنہ مایوسی طاری ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

(س) اپنی بابت ایک عرض یہ ہے کہ عموماً قرآن پاک سنتے یا خود پڑھتے وقت اس تصور سے کہ اللہ کا کیسا اچھا اور سچا کلام ہے، دل ایسا کھنچنے لگتا ہے کہ الجھن کے ساتھ آنسو جاری ہو کر آواز رک جاتی ہے۔ رسول ؐ،

صحابہؓ، علما، و مشائخ کے عبرت انگیز اقوال و افعال بیان کرتے وقت بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دونوں حالتوں میں مجبوراً ترک کر دینا پڑتا ہے

(ج) حالت محمود ہے۔ تاثرِ قلب سے رقت طاری ہو جاتی ہے۔ آواز اگر خود ہی بند ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ جب تک آواز کھلی رہے تذکرہ جاری رکھنے میں مطلق مضائقہ نہیں ہے۔

(س) بعض وقت اس خیال سے بھی کہ دوسرا شخص نہ محسوس کرے قصداً ناتمام چھوڑ دیتا ہوں۔

(ج) خیال بے جا ہے۔ دوسرا اگر محسوس کر بھی لے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

(۲۹)

حدودِ شرعی کے بارے میں ایک سوال

(س) (یہ صاحب ایک کالج میں پڑھاتے ہیں)۔ الحمدللہ کہ نمازِ ظہر کی ادائیگی آپ کی ہدایت اور ہمت دلانے سے اب کالج میں ہونے لگی ہے۔

(ج) الحمدللہ و بارک اللہ۔

(س) اللہ تعالیٰ استقامت بخشیں۔

(ج) آمین!

(س) ذہنی میلان زیادہ تر دین ہی کی جانب رہتا ہے۔ افکار و اعمال کو دین سے مربوط کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ اپنے علم کی حد تک کسی قسم کا عقلی الجھاؤ محسوس نہیں کرتا۔

(ج) الحمدللہ۔ بڑی نعمت حاصل ہو گئی۔

(س) عملی کوتاہیوں سے اب بھی چھٹکارا نہیں۔

(ج) ہمت کی برکت کے اثرات ان شاء اللہ اس میں بھی ظاہر ہوں گے۔

(س) اکثر خیال ہوتا ہے کہ دنیوی مشاغل سے کچھ عرصہ الگ رہ کر کسی صاحبِ طریقت

کی صحبت میں وقت گزارا جائے۔

(ج) مبارک خیال ہے۔ بشرطیکہ وظیفوں کی بھرمار سے احتیاط رہے اور خود دنیوی مشاغل سے علیحدگی بھی بہت توجہ طلب ہے۔ علیحدگی ناجائز شغلوں سے تو بہر صورت اختیار کرنا ہے۔ لیکن جائز مشغلے تو ایک حد تک ضروریات زندگی کا جزو ہیں، اور انھیں اخلاص نیت کے اہتمام کے ساتھ تو عین عبادت بنایا جا سکتا ہے۔

(س) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ بہ سلسلہ علاج اب گورکھپور سے منتقل ہو کر الہ آباد میں قیام پذیر ہیں...... اگر جی لگ گیا تو گرمی کی تعطیل میں کچھ عرصہ کے لیے الہ آباد ہی میں قیام کرنے کا ارادہ ہے۔

(ج) بہتر ہے۔ ضرور تجربہ کر لیا جائے۔ مولانا کا پتہ اب محلہ حسن منزل الہ آباد ہے اور صحت اب ماشاءاللہ بہتر ہے۔

(س) (کئی ورق کے ایک بڑے طویل مکتوب کا خلاصہ): تفسیر ماجدی میں ہے کہ جن گناہوں کے لیے حد شرعی مقرر ہے (شراب نوشی، زناکاری، چوری وغیرہ) وہ جب تک اجرا حد نہ ہو جائے محض توبہ و استغفار سے معاف نہیں ہو سکتے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ ایک شخص سے غلطی یا کوئی بہت ہی سخت لغزش ہو جائے۔ اب وہ لاکھ نادم ہو، ہر طرح توبہ و استغفار خلوص قلب کے ساتھ کر رہا ہو اور پختہ عہد اس معصیت کے نہ دہرانے کا کر رہا ہو، پھر بھی خدائے غفور و رحیم اس کو معاف نہیں کرتا ــــ یہ تو ارحم الراحمین سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر جب ایسی نظیریں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور اس زمانۂ حال میں بھی گزری ہیں کہ اکابر سے بھی اپنی عمر کے

کسی دور میں شدید لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوئیں لیکن بعد کو وہ ایسا سنبھلے کہ ان کا وجود اُمّت کے لیے باعثِ فخر بن گیا۔ (مثلاً فلاں اور فلاں) تو ایسے ایسے حضرات کو کیسے قیامت تک کیلئے معذّب و مقہور فرض کرلیا جائے؟

(ج) مسئلہ کی صحیح صورت وہی ہے جو خود سائل کے ذہن میں ہے۔ تفسیر میں عبارت تنگ رہ گئی ہے اور مسئلہ کی پوری صورت واضح نہ ہو سکی اللہ معاف فرمائے۔ اب اس میں تصحیح اور اصلاح تو صرف طبعِ ثانی ہی میں ممکن ہے۔ وہاں مُراد یقیناً یہ ہوگی کہ مجرم کی آہ و فریاد سے متاثر ہو کر کسی واجب الحد جُرم میں حد کا ساقط کر دینا کسی دنیوی حاکم، قاضی وغیرہ یہاں تک کہ پیمبر کے بھی اختیار میں نہیں۔ یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ عاصی تائب کو اللہ ارحم الراحمین بھی اپنی قدرت و رحمت سے معاف نہیں کر سکتا۔

جب کفر جلی اور شرک تک کہ ان سے بڑھ کر کوئی معصیت اس پردۂ زمین پر ممکن نہیں، توبہ کے بعد معاف ہو جاتے ہیں تو پھر شراب نوشی، چوری وغیرہ کے جُرم تو کہیں ہلکے ہیں۔ ان کی بُنیاد پر بندۂ تائب کیوں مایوس ہو جائے؟ قبولِ توبہ کا قانون (گناہ جو اور جیسا بھی ہو) قرآنِ مجید نے تین جگہ بڑی صراحت سے بیان کر دیا ہے۔ اور دلالتاً و ضمناً تو اور متعدد جگہ بھی۔

(۱) اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ

فَاُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (سورۃ النسار۔ ع ۳)۔

"اللہ کے ذمہ جس توبہ کا قبول کرنا ہے وہ تو بس انھیں لوگوں کی ہے جو کوئی بری حرکت نادانی سے کر بیٹھتے ہیں اور پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کر لیتا ہے۔ اللہ بڑا علم والا ہے، بڑا حکمت والا ہے۔"

مِنْ قَرِيْبٍ (وقتِ قریب میں) کی گنجائش صحابیوں اور تابعین کی مستند تفسیر میں قبل موت تک کی ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

(۲) كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الانعام۔ ع ۲)

"تمھارے پروردگار نے (اے مومنو) اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے بیشک تم میں سے جو کوئی نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے، پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے اور اپنی حالت درست کر لے تو اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا ہی رحمت والا ہے۔"

تیسری جگہ بھی ایسی ہی وضاحت اور صراحت ہے:۔

(۳) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورہ نحل۔ ع۔ ۱۵)

"پھر آپ کا ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے بری حرکت کر بیٹھے

پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور اپنے کو درست کرلیا تو آپ کا رب اس کے بعد بڑا مغفرت والا بڑا رحم والا ہے۔"

صراحتیں قبولِ توبہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہیں، اور خود توبہ کی حقیقت شریعت میں یہ بتائی گئی ہے کہ

(۱) ماضی پر ندامت ہو۔

(۲) مستقبل میں ترکِ معصیت کا عزم۔

(۳) تدارک و تلافی بقدرِ امکان۔

ایک جگہ بیان صراحت کے ساتھ واجب الحد مجرموں اور اُن کی سزاؤں کا ہے کہ:

"جو لوگ لڑتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور ملک میں فساد پھیلاتے رہتے ہیں، تو ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا وہ ملک بدر کر دیے جائیں۔ یہ تو ان کی رسوائی دنیا میں ہوئی۔ اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

لیکن انھیں باغیوں، خونیوں، ڈاکوؤں اور مفسدوں کے لیے معاً بعد ہی صراحت بھی موجود ہے:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(المائدہ۔ ع۔ ۵)

"مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ (اے مومنو) تم ان پر قابو پاؤ، تو جانے رہو کہ اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے"۔

تو توبہ کے بعد تو ایسے شدید، واجب الحد مجرموں سے بھی حد ساقط ہو جائے گی اور صفاتِ مغفرت و رحمت اپنی پوری تجلی دکھائیں گی۔

یہ تو عام قاعدہ ہوا۔ پھر ہندوستان اور پاکستان اور آج کے وہ سارے ملک جن میں نظامِ شریعت سرے سے برپا ہی نہیں، وہاں تو اجرائے حد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور حال کے جن مقبول بندوں (انھیں ملکوں کے باشندوں) کا نام سوال میں درج ہے ان سے ان کی مبینہ لغزشوں کے باوجود ضرور حسنِ ظن قائم رکھنا چاہیے۔

یہ جواب یہاں تک پہنچ کر ختم ہو رہا تھا کہ سورۃ البقرہ (پارہ سیقول) کی آیت ۱۹۲ نظر میں آ گئی۔ اوپر سے حکم مشرکین و معاندین سے قتال کا چلا آ رہا ہے، آگے ہے:

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"اگر یہ لوگ باز آ جائیں (کفر و شرک سے) جو محرک جنگ کا تھا تو اللہ بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے"۔

اور اس کے تحت میں فقہاء و مفسرین نے صراحتاً لکھا ہے کہ جب شرک و کفر سے توبہ قبول ہو سکتی ہے تو قتل عمد تو اس سے خفیف تر ہے۔ اس سے توبہ کیوں نہ قبول ہو گی، اور قاتل عمد کی توبہ کا مسئلہ اس سے مستنبط کیا ہے۔

ابو بکر جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن میں ہے:

"وھذا یدل علیٰ ان قاتل العمد لهٗ توبة وان کان الکفر اعظم ماثمًا من القتل وقد اخبراللہ ان یقبل اللہ التوبة منه و یغفر لهٗ"۔

"اس سے دلالت اس پر ہوتی ہے کہ قاتل عمد کی بھی توبہ ہو سکتی ہے کیونکہ کفر تو گناہ میں بہرحال قتل سے بڑھا ہوا ہے اور اللہ یہاں خبر دے رہا ہے کہ وہ کافر کی توبہ قبول کرلیتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔"

اور ابنِ حیان کی تفسیر بحر المحیط میں ہے:۔

"وفیه دلالة علی قبول توبة قاتل العمد ان کان الکفر اعظم ماثمًا من القتل وقد اخبر تعالیٰ انهٗ یقبل التوبة من الکفر"۔

"آیت میں دلالت ہے قاتل عمد کی قبول توبہ پر اس لیے کہ کفر تو قتل عمد سے بڑھ کر معصیت ہے اور اللہ خبر دے رہا ہے کہ وہ کفر سے توبہ قبول کرلیتا ہے"۔

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھ دیا ہے:۔

"دلالت الآیة علی ان التوبة من کل ذنب مقبولة و قول من قال التوبة من القتل العمد

غیر مقبولة خطالأن الشرك هواشد من القتل فاذا قبل الله توبة الکافر فقبول توبة القاتل اولیٰ "

" آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ توبہ ہر گناہ سے قبول ہو سکتی ہے اور جس نے یہ کہا کہ قاتل عمد کی توبہ غیر مقبول رہتی ہے اس نے اس قول میں غلطی کی۔ اس لیے کہ شرک تو قتل سے شدید تر ہے۔ تو جب اللہ کافر کی توبہ قبول کر لیتا ہے تو قاتل کی توبہ تو قبول کی مستحق تر ہے۔"

اور صاحبِ رُوح المعانی نے بھی صاحب بحر کے قول کو دُہرا دیا ہے۔ دل کو بڑی تقویت دین کے ان زبردست شارحوں کی تائید سے حاصل ہو گئی۔

اس کے بعد ہی ذہن ابن القیم کی مشہور کتاب اعلام الموقعین کی طرف گیا۔ اصل کتاب تو فی الفور موجود نہ تھی، البتہ اس کا اُردو ترجمہ "دلائل المحققین" کے نام سے مل گیا۔ سند کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ اس میں ذیل کی عبارتیں نظر پڑ گئیں :-

" اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان گناہوں پر حد واجب کر دی جن کے ارتکاب کا طبعی تقاضا ہے اور جن کی روک تھام طبعاً نہیں ہے۔ حدیں خدا کی سزائیں ہیں۔ دنیا میں جیسے اس کی سزائیں ہیں آخرت میں بھی ہیں۔ جبکہ وہ لوگ بے توبہ مریں۔ ہاں توبہ کرنے والا خدا کے نزدیک مثل گناہ نہ کرنے والے

سکے ہے۔ بس جس نے موت سے پہلے خالص توبہ کرلی، اسے اس گناہ پر سزا نہ دے گا۔ یہی حال احکامِ دنیا کا رکھا ہے کہ جب اس نے خلوص سے توبہ کرلی اس سے پہلے کہ اسے امام تک پہونچایا جائے تو اس کے اوپر سے حد کر گئی۔ زیادہ صحیح قول علماء کا یہی ہے۔ لیکن جب امام تک معاملہ پہونچ گیا تو اب توبہ سے حد ساقط نہ ہوگی۔"

(دلائل المحققین حصہ پنجم ص۱۰۱ ک ۲ مطبوعہ دہلی)

چند فقروں کی خصوصی اہمیت ظاہر کرنے کو انھیں جلی کر دیا گیا ہے۔

اور خیر یہ سوال تو پھر بھی ہلکا یعنی توبہ کے بعد اسقاط حد کا ہے۔ قرآنِ مجید میں تو اس سے بھی بڑھ کر یعنی بغیر توبہ کے بھی مغفرت کی بشارت موجود ہے۔ سورہ رعد (پ ۱۳) میں آیت نمبر ۶ کے اندر خود یہ الفاظ موجود ہیں:۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ

"اور بیشک آپ کا پروردگار لوگوں کے حق میں باوجود ان کے ظلم کے صاحب مغفرت ہے۔"

جس کے لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ:۔

"لیس فی القرآن ارجیٰ اٰیۃ من ھذہ"

"قرآن مجید میں اس سے بڑھ کر پرامید و پرتسلّی کوئی آیت نہیں ہے۔"

علیٰ ظلمھم کی تصریحِ قرآنی پر غور ہو، توبہ کے بعد تو گنہگار گنہگار باقی ہی نہیں رہتا۔ اس کا گناہ معاف ہو ہی جاتا ہے۔ یہاں تو یہ تصریح ہے کہ بندوں کے ظلم و زیادتی کے ہوتے ہوئے اللہ اس کے حق میں صاحبِ مغفرت ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ غیر تائبین کے بھی حق میں صاحبِ مغفرت ہے۔ اکابر اہلِ سنّت کا تو یہی مسلک ہے۔ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں کہتے ہیں: ——

"فاعلم ان اصحابنا تمسکوا بھذہ الآیۃ علی انہ تعالیٰ قد یعفو عن صاحب الکبیر قبل التوبۃ"

"ہمارے بزرگوں (یعنی اہلِ سنّت) نے آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کبیرہ بغیر توبہ کے بھی معاف کر دیتا ہے۔"

اور بیضاوی میں ہے: ——

"والتقیید بہ دلیل علی جواز العفو قبل التوبۃ فان التائب لیس علیٰ ظلمہ۔"

"علیٰ ظلمہ کی قید اس پر دلیل ہے کہ توبہ کے بغیر بھی معافی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جو تائب ہو گیا وہ پھر ظالم ہی کہاں رہا۔"

(۳۰)

مزارات پر حاضری اور فاتحہ

(س) عرصۂ دراز کے بعد حضرت عالی میں عریضہ گزار رہا ہوں۔ آنجناب کے وقت پر بار ڈالنا خود اپنے ہی پر گراں گزرتا ہے۔

(ج) جزاک اللہ۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ط

(س) اولیائے کرام اور بزرگان دین کے مزارات کی زیارت اور خود وہاں حاضر ہو کر فاتحہ پڑھنا اور دعا کرنا ثواب و برکت کا موجب کس اصل کی بنا پر ہے۔؟ خاص اس قطعۂ ارض کی اہمیت کس وجہ سے ہے؟

(ج) زمین سے جسد ظاہری کے تلبس کی بنا پر، روضۂ نبوی پر حاضری کی اہمیت بھی اسی بنا پر ہے

رُوحِ بلاجسد کا مستقر تو عالم برزخ ہے لیکن کوئی تعلقِ خصوصی موقع دفن جسم سے یا قبر سے قائم رہتا ہے۔

(س) نظام تشریعی میں شیطان کی حیثیت کیا ہے؟

(ج) نفس میں بدی کی تحریک ہر وقت کرتے رہنے والا۔ سورج کی کرنوں یا ہوا کی طرح اس عالم ناسوت میں ہر جگہ دائر و سائر۔

(س) ابلیس کے ساتھ کیا اس کا کوئی گروپ سرگرمِ کار رہتا ہے؟

(ج) اس کی ذریات۔ اولاد و تناسل کا سلسلہ جس طرح جنات میں قائم ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی نسل میں بھی ہوگا۔

(س) الحمد للہ معمولات برابر ادا ہو رہے ہیں، اور آپ بزرگوں کی توجہ کی برکت سے الحمد للہ قلب کا تعلق اللہ پاک سے ہو گیا ہے۔ ہر وقت اللہ پاک کا دھیان رہتا ہے۔ مزید توفیق و استقامت کے لیے دعا فرمائیں۔

(ج) اگر یہ تشخیصِ نفس صحیح ہے تو قابلِ رشک ہے۔ اب اس سے زیادہ اور چاہیئے ہی کیا!

(س) (ایک بڑا لمبا سوال جس کا خلاصہ یہ ہے کہ) امام غزالیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے رُوح کو عالمِ امر کی چیز بتایا ہے۔ لیکن مفسّر حقّانی نے روح کو مخلوق اور ایک طرح کا جسم لطیف بتایا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو غزالی و حقانی کے اقوال نیز آیۂ کریمہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے ساتھ اس کی تطبیق کیونکر ہوگی؟

(ج) ماہیتِ رُوح کی بحث نازک و دقیق ہی ہے اور ہم عامیوں کے لیے بالکل غیر ضروری بھی۔ پھر اس کی تحقیق بھی جیسی چاہیئے مکتوب الیہ کو حاصل نہیں۔

رُوح کو عالمِ امر کے متعلق و ماتحت ہونا اس کی مخلوقیت و حدوث کے منافی نہیں۔ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید بھی ایک اعتبار سے (یعنی جیسا کہ وہ اپنی مرتب و مدون شکل میں ہے) مخلوق و حادث

ہی ہے البتہ دوسرے اعتبار سے یعنی کلام الٰہی کے منجملہ صفاتِ الٰہی ہونے کے لحاظ سے اللہ کی ہر صفت کی طرح قدیم وغیر مخلوق بھی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال رُوح کا بھی ہے۔ ایک لحاظ سے صفتِ الٰہی اور اسلیے قدیم۔ دوسرے یعنی قیود زمانی ومکانی کے لحاظ سے مخلوق وحادث ـــــ بہر حال اپنے کام سے کام رکھے اور بلا ضرورت ان دقیق اور غیر ضروری بحثوں میں اپنا دماغ نہ کھپائے۔

قرآن مجید میں مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے معاً بعد وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا کی تنبیہ بڑی معنی خیز ہے۔ یعنی انسان کو علم تو بہت ہی تھوڑا عطا ہوا ہے، اسے چاہیے کہ اتنے ہی پر قناعت کرے اور زیادہ اونچی مگر بے نتیجہ بحثوں کے پھیر میں خواہ مخواہ نہ پڑے۔

(س) مولانا ...... مدظلہ کی خدمت میں حاضری اب تک نہ دے سکا۔ کوئی تذبذب دل میں نہیں ہے۔ صرف تساہل ہے۔ جون میں حاضری کا پروگرام تھا لیکن اس مہینے میں طبیعت اکثر ناساز رہا کی .... اب موقع ان شاء اللہ اکتوبر میں ہوگا۔

(ج) یہ ناسازی وعلالت خود بھی ایک معقول عذر ہے اور موجب اجر بھی۔

(س) (یہ صاحب ایک کالج میں سائنس کے اُستاد ہیں) تعطیل کے بعد کالج کھل گیا ہے اور کام شروع ہے۔ اللہ نے اپنے اس بے مایہ اور کم سواد بندے کو اپنے لطف وکرم سے طالب علموں اور ساتھی اُستادوں میں کافی عزت دے رکھی ہے اور یہ زیادہ تر ان کی خوش فہمی

کی وجہ سے رہے ۔ بے شک عزّت اور بڑائی اللہ تعالیٰ ہی بندہ کو بخشتا ہے دینی صلاحیت جو ہوئی ہے وہ تو بندہ ہی خوب سمجھتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنی طرف سے اس کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ کسی کو مایوسی کا موقع نہ ملے ۔

(ج) ماشاء اللہ خیال بالکل صحیح ہے اور جذبہ بھی بالکل صحیح اور یہی معنی ہیں حدیثِ نبویؐ کی اس دُعا کے ، کہ :

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا

"اے اللہ ! مجھے میری نظر میں چھوٹا بنا دے اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دے ۔"

(س) انٹرمیڈیٹ کے دو ایک اچھے طالب علم مجھے گھیر رہے ہیں کہ خالی وقت میں انھیں کچھ پڑھا دیا کروں ۔ ان کا شوق دیکھ کر راضی ہو گیا ہوں لیکن وقت زیادہ دینا پڑے گا ۔ یہ بہت اچھے طالب علم ہیں یو پی میں پوزیشن پانے والے ۔ اور میں ہوں کہ بی ایس سی (B.sc) میں تھرڈ کلاس پائی تھی ۔ اپنی کم علمی اور ان کی گرویدگی دیکھتا ہوں تو دل بہت متاثر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عزّت کے یہ کیا سامان ہو رہے ہیں ۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی ہوں کہ اس میں اپنی رسوائی پوشیدہ نہ ہو ۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں ۔

(ج) ماشاء اللہ و بارک اللہ ! یہی سوچتے اور یہی سمجھتے رہنا چاہیے ۔

(س) پچھلی زندگی سختی اور صعوبتوں میں گزری ہے ۔ اب بڑی حد تک اللہ نے

آسائش اور اطمینان دے رکھا ہے۔ اپنی طبیعت کا اندازہ اب بھی لگا لیتا ہوں کہ پھر کبھی تنگی سے دوچار ہونا پڑے تو کیونکر گزرے گی طبیعت آسانی ہی چاہتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کرتا ہوں۔ آنجناب کی رہنمائی چاہتا ہوں کہ ایسی صورت میں طرزِ عمل کیا رہے کہ بحیثیت مجموعی زیادہ سے زیادہ اطمینان رہے۔؟

(ج) خود اسی احساس کو اس کے جزئیات کے ساتھ زندہ و بیدار رکھا جائے۔ انشاءاللہ یہی احساس کافی ہو جائے گا۔

(س) (آگے لکھنؤ کے ایک روزنامہ کے تین گرم گرم مضامین کا ذکر اور اس پر اپنے تاثرات)۔

(ج) دنیا نام ہی اسی کشمکش حق و باطل کا ہے اور اسی کی شدت سے گھبرا کر تو مجوس نے دو مستقل خدا نور و ظلمت کے مان لیے ہیں۔ اللہ بس ہدایت پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی